اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مئی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مئی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء

شمارہ نمبر ۱۶

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا کیا کہاں کہاں

اداریہ

پرانے چاول

قندِ شیریں

چوکے ہی چوکے

ہنسپتالیات

سفر وسیلۂ ظفر

ہزلیات و غزلیات

قسطوں قسط

کالم گلوچ

کتابی چہرے

نظمالوجی

مزاحچے

جستہ خستہ

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سکین نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب وجوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

اداریہ

شرگوشیاں

ویسے تو تنقید کی کئی قسمیں ہیں لیکن بنیادی طور پر تنقید دو ہی قسم کی ہوتی ہے۔ تنقید برائے تنقید اور ادبی تنقید۔

تنقید برائے تنقید ہر کوئی ہر وقت اور ہر چیز پر کر سکتا ہے کیونکہ اس کے لئے کسی علم اور سلیقے کی ضرورت نہیں ہوتی، بس کچھ مخاصمت اور کچھ فرصت اور بہت زیادہ بے عملی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کچھ کرنے والوں کو کسی پر تنقید کی فرصت ہے نہ ضرورت۔ اسی لئے ناکام لوگ سب سے زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں کیونکہ جب وہ صلاحیت کے میدان میں کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو تنقید برائے تنقید سے کام لیتے ہیں، یہی تنقید آگے بڑھ کر طنز کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ تنقید کی ذرا بہتر صورت ہے جس میں کچھ سلیقہ اور مہارت جھلکتی ہے لیکن اس کی تہ میں زہر زیادہ ہوتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ مزاح ہو تو زیادہ مؤثر ہوتی ہے ورنہ ردعمل پیدا کرتی ہے جس کے نتائج خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ تنقید کے ماہر تو سبھی ہوتے ہیں لیکن طنزیہ تنقید کی مہر زیادہ تر بیویاں ہوتی ہیں، جس سے شاید ہی کوئی شوہر محفوظ ہو۔ مزید ستم ظریفی یہ کہ عورتیں اپنے طنز میں مزاح کو ملانا قطعاً پسند نہیں کرتیں کہ کہیں وہ خوشگوار ہو کر بے اثر نہ ہو جائے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ تنقید اور طنز کے کچھ فوائد بھی ہیں کہ اس سے انسان کو اپنی خامیوں کا علم ہوتا ہے اور مزید طنز یا تنقید سے بچنے کے لئے انسان اپنی اصلاح کی کوشش کرتا ہے بے شمار ناکام لوگوں کے پھر سے کامیاب ہونے کے پیچھے عموماً لوگوں کی تنقید یا طنز ہوتا ہے حالانکہ یہ منفی جذبہ ہے پھر بھی یہ خوشامد سے بہتر ہے جس میں خامیوں کو بھی خوبیاں بنا کر پیش کیا جاتا ہے جس سے انسان کی اصلاح و ترقی رک جاتی ہے۔

ادبی تنقید کی آگے بے شمار قسمیں ہیں لیکن ہم صرف اُن قسموں کو بیان کریں گے جن کو عموماً بیان نہیں کیا جاتا بلکہ خوشنما لفظوں اور اصلاحات کے پردوں کے پیچھے چھپا دیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی قسم ''تنقید برائے تذلیل'' ہے۔ اس میں اچھی خاصی تحریر کو تنقید کی سان پہ چڑھا کر اس میں ایسی ایسی خامیاں نکالی جاتی ہین کہ لکھنے والا پڑھ کے تائب ہو جائے اور ایسی تنقید کا مقصد بھی عموماً یہی ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا مصنف یا تو نیا ہوتا ہے اور اس نے اس ادبی دلدلے میں بیعت نہیں لی ہوتی یا مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا اس نے ناقدین کو کوئی اہمیت دیے بنا میدانِ ادب میں جھنڈے گاڑنے کی جسارت کی ہوتی ہے۔

تنقید کی دوسری خفیہ قسم ''تنقید برائے تحسین'' ہوتی ہے جس میں ردی سے ردی تحریر کا درجہ غالب اور اقبال کی تحریروں کے برابر دیا جاتا ہے اور اگر تحریر کسی صاحبِ اقتدار کی ہو تو ان سے آگے بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ خوشامدانہ تنقید عموماً اپنے گروپ کے مصنفین کی تحریروں پر کی جاتی ہے یا ان تحریروں پر جن کے مصنفین نے تنقیدی باوؤں کی کماحقہ خوشامد یا خدمت کی ہوتی ہے۔

تنقید کی تیسری خفیہ قسم ''متنازعہ تنقید'' کی ہے جس میں جان بوجھ کر کچھ تحریروں کو متنازعہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے جس سے ان میں میں باغیانہ یا اختلافی نکات تلاش کر لئے جاتے ہیں جو مصنف کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ عموماً ذاتی یا گروہی دشمنی ہوتی ہے اور یہ تنقید ارادہ قتل سے کم نہیں ہوتی، یہ الگ بات کہ ایسی تنقید سے بعض اوقات مصنف زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔

خادم حسین مجاہد

میں نے شاہدہ سے کہا ”تو میں جا کے اب کنجیاں لے آؤں!“

شاہدہ نے کہا ”آخر تو کیوں اپنی شادی کے لئے اتنی تڑپ رہی ہے؟ اچھا جا۔“

میں ہنستی ہوئی چلی گئی۔ کمرہ سے باہر نکلی۔ دوپہر کا وقت تھا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اماں جان اپنے کمرہ میں سو رہی تھیں اور ایک خادمہ پنکھا جھل رہی تھی۔ میں چپکے سے برابر والے کمرے میں پہنچی اور مسہری کے تکیہ کے نیچے سے کنجی کا گچھا لیا۔ سیدھی کمرے پر واپس آئی اور شاہدہ سے کہا ”جلدی چلو!“

ہم دونوں نے چپکے سے چلتے ہوئے کہ کہیں کوئی پیر کی آہٹ نہ سن لے زینے کی راہ لی، اور ابا جان والی چھت پر داخل ہوئی۔ وہاں بھی حسب توقع سناٹا پایا۔ سب سے پہلے دوڑ کر میں نے دروازہ بند کر دیا جو باہر زینے سے آنے جانے کے لئے تھا۔ اس کے بعد یہ دروازہ بھی بند کر دیا جس سے ہم دونوں داخل ہوئے تھے۔ سیدھی ابا جان کے کمرہ میں پہنچ کر ان کی الماری کا تالہ کھولا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ سامنے بیچ کے تختہ پر تمام خطوط اور تصویریں رکھی ہیں۔

”وہ دیکھ! وہ دیکھ!، وہ اچھا ہے۔“ شاہدہ نے کہا۔

”نہیں شروع سے دیکھو۔۔۔۔ ادھر سے!!“ یہ کہہ کر میں نے شروع کا بنڈل کھولا اور اس میں سے تصویر نکالی۔ یہ ایک پروفیسر صاحب کی تصویر تھی۔ جن کی عمر پینتیس سال کی ہوگی۔ یہ نہایت ہی عمدہ سوٹ پہنے بڑی شان سے کرسی کا تکیہ پکڑے کھڑے تھے۔ کرسی پر ان کا پانچ سال کا بچہ بیٹھا تھا۔ ان کی پہلی بیوی مر چکی تھیں۔ اب مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ نام اور پتہ وغیرہ سب تصویر کی پشت پر موجود تھا۔

”یہ لے!“ شاہدہ نے کہا۔ ”پہلی ہی بسم اللہ غلط۔“

میں نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا ”کیوں؟ کیا یہ برا ہے؟“

”کمبخت یہ دوہا جو ہے،، بہن اس سے بھول کے بھی مت کچھ۔

تو تو اپنی طرح کوئی کنوارا ڈھونڈھ۔ اری ذرا اس لونڈے کو دیکھ! اگر نہ تیرا یہ ناک میں دم کر دے اور نتھنوں میں تیر ڈال دے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجیو۔ دیکھتی نہیں کہ بس کی گانٹھ کتنا شریر ہے۔ اور پھر راتوں کو تیری سوت خواب میں الگ آ کر گلا دبائے گی۔"

"تو تو پاگل ہوگئی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاہدہ ڈھنگ کی باتیں کر۔"

شاہدہ ہنستے ہوئے بولی "میری بلا سے۔ کل کی کرتی تو آج کر لے میری دانست میں تو اس پروفیسر کو بھی کوئی ایسی ہی ملے تو ٹھیک رہے جو دو تین موذی بچے جہیز میں لائے۔ اور وہ اس کے چھوکرے کو مارتے مارتے الو کر دیں۔ چل رکھ اس کو۔۔۔ دوسری دیکھ۔"

پہلی تصویر پر یہ ریمارکس پاس کئے گئے اور اس کو جوں کا توں رکھ کر دوسری تصویر اٹھائی اور شاہدہ سے پوچھا۔ "یہ کیسا ہے؟"

شاہدہ غور سے دیکھ کر بولی۔ "ویسے تو ٹھیک ہے مگر ذرا کالا ہے۔ کون سے درجے میں پڑھتا ہے؟"

میں نے تصویر دیکھ بھال کر کہا۔ "بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ کالا تو ایسا نہیں ہے۔"

شاہدہ نے کہا "ہوں! یہ آخر تجھے کیا ہوگیا ہے، جسے دیکھتی ہے اس پہ عاشق ہوئی جاتی ہے۔ نہ کالا دیکھتی ہے نہ گورا، نہ بڈھا دیکھتی ہے نہ جوان!" میں نے زور سے شاہدہ کے چٹکی لے کر کہا۔ "کمبخت میں نے تجھے اس لئے بلایا تھا کہ تو مجھے تنگ کرے! غور سے دیکھ۔"

غور سے تصویر دیکھ کر اور کچھ سوچ کر شاہدہ بولی "نہ بہن یہ ہرگز ٹھیک نہیں، میں تو کہہ چکی، آئندہ تو جانے۔"

میں نے کہا۔ "خط تو دیکھ، بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔"

یہ تصویر ایک طالب علم کی تھی جو ٹینس کا بلا لئے بیٹھا تھا۔ دو تین تمغے لگائے ہوئے تھا اور دو تین جیتے ہوئے کپ سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔

شاہدہ بولی۔ "ویسے تو لڑکا بڑا اچھا ہے۔ عمر میں تیرے جوڑ کا ہے۔ مگر ابھی پڑھتا ہے اور تیرا بھی شوکت کا سا حال ہوگا کہ دس روپے ماہوار جیب خرچ اور کھانے اور کپڑے پر نوکر ہو جائے گی اور دن رات ساس نندوں کی جوتیاں، یہ تو جھگڑا ہے۔"

میں نے کہا "بی اے میں پڑھتا ہے، سال دو سال میں نوکر ہو جائے گا۔"

"ٹینس کا جمعدار ہو رہا ہے تو دیکھ لیجو دو تین دفعہ فیل ہوگا اور ساس نندیں بھی کہیں گی کہ بیوی پڑھنے نہیں دیتی اور پھر دوڑنے دھوپنے کا شوقین، تجھے رپٹا مارے گا۔ ویسے تو لڑکا اچھا ہے، صورت بھی بھولی بھالی ہے اور ایسا ہے کہ جب شرارت کرے، اٹھا کر طاق پر بٹھا دیا۔ مگر نہ بابا میں رائے نہ دوں گی۔"

اس تصویر کو بھی رکھ دیا اور اب دوسرا بنڈل کھولا اور ایک اور تصویر نکلی۔

"آخاہ! یہ مواپان کا غلام کہاں سے آیا!!" شاہدہ نے ہنس کر کہا "دیکھ تو کمبخت کی ڈاڑھی کیسی ہے اور پھر مونچھیں اس نے ایسی کتروائی ہیں کہ جیسے سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل جائے!"

میں بھی ہنسنے لگی۔ یہ ایک معزز رئیس آنریری مجسٹریٹ تھے اور ان کی عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ مگر مجھ کو یہ ذرہ بھر پسند نہ آئے۔

غور سے شاہدہ نے تصویر دیکھ کر پہلے تو ان کی نقل بنائی اور پھر کہنے لگی۔ "ایسے کو بھلا کون لڑکی دے گا؟" "نہ معلوم اس کے کتنی لڑکیاں اور بیویاں ہوں گی۔ پھینک اسے۔"

یہ تصویر بھی رکھ دی گئی اور دوسرا بنڈل کھول کر ایک اور تصویر لی۔

"یہ تو گبرو جوان ہے؟ اس تو فوراً کر لے!" شاہدہ تصویر دیکھ کر بولی "یہ ہے کون! ذرا دیکھ۔"

میں نے دیکھ کر بتایا کہ ڈاکٹر ہے۔

"بس بس، یہ ٹھیک، خوب تیری نبض ٹٹول ٹٹول کے روز تھرمامیٹر لگائے گا۔ صورت شکل ٹھیک ہے۔" شاہدہ نے ہنس کر کہا "میرا میاں بھی ایسا ہی ہٹا کٹا موٹا تازہ ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا "کمبخت آخر تو ایسی باتیں کہاں سے سیکھ آئی ہے، کیا تو نے اپنے میاں کو دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ بہت اچھا ہے!"

’’بھدا سا ہوگا۔‘‘

شاہدہ نے چیں بچیں ہو کر کہا۔ ’’اتنا تو میں جانتی ہوں کہ جو کہیں تو اُسے دیکھ لے تو شاید لٹو ہی ہو جائے۔‘‘

میں نے اب ڈاکٹر صاحب کی تصویر کو غور سے دیکھا اور نکتہ چینی شروع کی۔ نہ اس لئے کہ مجھے یہ ناپسند تھے، بلکہ محض اس لئے کہ کچھ رائے زنی ہو سکے۔ چنانچہ میں نے کہا ’’ان کی ناک ذرا موٹی ہے۔‘‘

’’سب ٹھیک ہے۔‘‘ شاہدہ نے کہا ’’ذرا اس کا خط دیکھ۔‘‘

میں نے دیکھا کہ صرف دو خط ہیں۔ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ان کی پہلی بیوی موجود ہیں مگر پاگل ہو گئی ہیں۔

’’پھینک پھینک اسے کمبخت کو پھینک۔‘‘ شاہدہ نے جل کر کہا ’’جھوٹا ہے کمبخت کل کو تجھے بھی پاگل خانہ میں ڈال کے تیسری کو تکے گا۔‘‘

ڈاکٹر صاحب بھی نامنظور کر دیے گئے اور پھر ایک اور تصویر اٹھائی۔

شاہدہ نے اور میں نے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ یہ تصویر ایک نوعمر اور خوبصورت جوان کی تھی۔ شاہدہ نے پسند کرتے ہوئے کہا ’’یہ تو ایسا ہے کہ میری بھی رال ٹپکتی پڑ رہی ہے۔ دیکھ تو کتنا خوبصورت جوان ہے۔ بس اس سے تو آنکھ میچ کے کر لے اور اسے گلے کا ہار بنا لیجیو۔‘‘

ہم دونوں نے غور سے اس تصویر کو دیکھا ہر طرح دونوں نے پسند کیا اور پاس کر دیا۔ شاہدہ نے اس کے خط کو دیکھنے کو کہا۔ خط جو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ولایت میں پڑھتے ہیں۔

’’ارے توبہ توبہ، چھوڑ اسے۔‘‘ شاہدہ نے کہا۔

میں نے کہا ’’کیوں؟ آخر کوئی وجہ؟؟؟‘‘

’’وجہ یہ کہ بھلا اسے وہاں میمیں چھوڑیں گی۔ عجب نہیں کہ ایک آدھ کو ساتھ لے آئے۔‘‘

میں نے کہا ’’واہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ احمد بھائی کو دیکھو، پانچ سال ولایت میں رہے تو کیا ہو گیا۔‘‘

شاہدہ تیزی سے بولی ’’بڑے احمد بھائی احمد بھائی، رجسٹر

اُن دنوں کوئی کام نہیں تھا، اس لئے عمران صبح سے ’’تان پورا‘‘ اُٹھا لیتا اور پکے راگوں کی مشق شروع ہو جاتی۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے بیک وقت کئی بکرے ’’ہجر‘‘ کی شکایت کر رہے ہوں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے کتوں کے ’’دارالعوام‘‘ میں کسی اختلافی مسئلے پر بحث چھڑ گئی ہو۔

چالیس ایک باون از ابنِ صفی

لے کر وہاں کی بھاوجوں کے نام لکھنا شروع کرے گی تو عمر ختم ہو جائے گی اور رجسٹر تیار نہ ہوگا۔ میں تو ایسا جوا نہ کھیلوں اور نہ کسی کو صلاح دوں۔ یہ ادھار کا سا معاملہ ٹھیک نہیں۔‘‘

یہ تصویر بھی ناپسند کر کے رکھ دی گئی اور اس کے بعد ایک اور نکالی۔ شاہدہ نے تصویر دے کر کہا ’’یہ تو اللہ رکھے اس قدر باریک ہیں کہ سوئی کے ناکہ میں سے نکل جائیں گے۔ علاوہ اس کے کوئی آندھی بگولا آیا تو یہ اڑا اڑا جائیں گے اور تو رانڈ ہو جائے گی۔‘‘

اِسی طرح دو تین تصویریں اور دیکھی گئیں کہ اصل تصویر آئی اور میرے منہ سے نکل گیا ’’اخاہ!‘‘

’’مجھے دے۔ دیکھوں، دیکھوں۔‘‘ کہہ کر شاہدہ نے تصویر لے لی۔

ہم دونوں نے غور سے اس کو دیکھا۔ یہ ایک بڑی سی تصویر تھی۔ ایک تو وہ خود ہی تصویر تھا اور پھر اس قدر صاف اور عمدہ کھنچی ہوئی کہ بال بال کا عکس موجود تھا۔ شاہدہ نے ہنس کر کہا ’’اسے مت چھوڑیو۔ ایسے میں تو میں دو کر لوں۔ یہ آخر ہے کون؟‘‘

تصویر کو الٹ کر دیکھا جیسے دستخط اوپر تھے ایسے ہی پشت پر تھے مگر شہر کا نام لکھا ہوا تھا اور بغیر خطوط کے دیکھے ہوئے مجھے معلوم ہو گیا کہ کس کی تصویر ہے۔ میں نے شاہدہ سے کہا ’’یہ وہی ہے جس کا میں نے تجھ سے اس روز ذکر کیا تھا۔‘‘

’’اچھا یہ بیرسٹر صاحب ہیں۔‘‘ شاہدہ نے پسندیدگی کے لہجہ میں کہا ’’صورت شکل تو خوب ہے، مگر ان کی کچھ چلتی بھی ہے یا نہیں؟‘‘

میں نے کہا ’’ابھی کیا چلتی ہوگی۔ ابھی آئے ہوئے دن ہی

کتنے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر ہوا کھاتے ہوں گے۔" شاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا "خیر تو اس سے ضرور کر لے۔ خوب تجھے موٹروں پر سیر کرائے گا، سینما اور تھیٹر دکھائے گا اور جلسوں میں نچائے گا۔"

میں نے کہا "کچھ غریب تھوڑی ہیں۔ ابھی تو باپ کے سر کھاتے ہیں۔"

شاہدہ نے چونک کر کہا "اری بات تو سن۔"

میں نے کہا "کیوں؟"

شاہدہ بولی "صورت شکل بھی اچھی ہے۔ خوب گورا چٹا ہے۔ بلکہ تجھ سے بھی اچھا ہے اور عمر بھی ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتا کہ کہیں کوئی میم ویم تو نہیں پکڑ لایا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم۔ لیکن اگر کوئی ساتھ ہوتی تو شادی کیوں کرتے۔"

"ٹھیک ٹھیک۔" شاہدہ نے سر ہلا کر کہا "بس اللہ کا نام لے کر پھانس!"

میں نے خط اٹھائے اور شاہدہ دوسری تصویریں دیکھنے لگی۔ میں خط پڑھ رہی تھی اور وہ ہر ایک تصویر کا منہ چڑا رہی تھی۔ میں نے خوش ہو کر اس کو چپکے چپکے خط کو کچھ حصہ سنایا۔ شاہدہ سن کر بولی "الا اللہ!" میں نے اور آگے پڑھا تو کہنے لگی۔ "وہ مارا۔" غرض خط کا سارا مضمون سنایا۔

شاہدہ نے خط سن کر کہا کہ "یہ تو سب معاملہ فٹ ہے اور چول بیٹھ گئی ہے۔ اب تو گڑ تقسیم کر دے۔"

پھر ہم دونوں نے اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ دونوں نے رہ رہ کر پسند کیا۔ یہ ایک نوعمر بیرسٹر تھے اور غیر معمولی طور پر خوبصورت معلوم ہوتے تھے اور ناک نقشہ سب بے عیب تھا۔ شاہدہ رہ رہ کر تعریف کر رہی تھی۔ ڈاڑھی مونچھیں سب صاف تھیں اور ایک دھاری دار سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔

میں نے بیرسٹر صاحب کے دوسرے خط پڑھے، اور مجھ کو کل حالات معلوم ہو گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ بیرسٹر صاحب بڑے اچھے اور رئیس گھرانے کے ہیں اور شادی کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ آخری خط سے پتہ چلتا تھا کہ صرف شادی کی تاریخ کے معاملہ میں کچھ تصفیہ ہونا باقی ہے۔

میں نے چاہا کہ اور دوسرے خط پڑھوں اور خصوصاً آنریری مجسٹریٹ صاحب کا مگر شاہدہ نے کہا "اب دوسرے خط نہ پڑھنے دوں گی۔ بس یہی ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "ان کے ذکر کی بھنک ایک مرتبہ سن چکی ہوں۔ آخر دیکھ تو لینے دے کہ معاملات کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔"

شاہدہ نے جھٹک کر کہا "چل رہنے دے اس موذی کا ذکر تک نہ کر!"

میں نے بہت کچھ کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی۔ قصہ مختصر، جلدی جلدی سب چیزیں جوں کی توں رکھ دیں، اور الماری بند کر کے میں نے مردانہ زینہ کا دروازہ کھولا اور شاہدہ کے ساتھ چپکے سے جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس ہوئی۔ جہاں سے کنجی لی تھی، اسی طرح رکھ دی۔ شاہدہ سے دیر تک بیرسٹر صاحب کی باتیں ہوتی رہیں۔ شاہدہ کو میں نے اسی لئے بلایا تھا۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی گئی مگر اتنا کہتی گئی کہ خالہ جان کی باتوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تیری شادی اب بالکل طے ہو گئی اور تو بہت جلد لٹکائی جائے گی۔

اِس بات کو مہینہ بھر سے زائد گزر چکا تھا۔ کبھی تو ابا جان اور اماں جان کی باتیں چپکے سے سن کر ان کے دل کا حال معلوم کرتی تھی اور کبھی اوپر جا کر الماری سے خطوط نکال کر پڑھتی تھی۔

میں دل ہی دل میں خوش تھی کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت بھلا کون ہو گی کہ یک لخت معلوم ہوا کہ معاملہ طے ہو کر بگڑ رہا ہے۔

آخری خط سے معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب کے والد صاحب چاہتے ہیں کہ بس فوراً ہی نکاح اور رخصتی سب ہو جائے اور اماں جان کہتی کہ میں پہلے صرف نسبت کی رسم ادا کروں گی اور پھر پورے سال بھر بعد نکاح اور رخصتی کروں گی کیونکہ میرا جہیز وغیرہ کہتی تھیں کہ اطمینان سے تیار کرنا ہے اور پھر کہتی تھیں کہ میری ایک

ہی اولاد ہے۔ میں تو دیکھ بھال کے کروں گی۔ اگر لڑکا ٹھیک نہ ہوا تو منگنی توڑ بھی سکوں گی۔ یہ سب باتیں میں چپکے سے سن چکی تھی۔

ادھر تو یہ خیالات، ادھر بیرسٹر صاحب کے والد صاحب کو بے حد جلدی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر آپ جلدی نہیں کر سکتے تو ہم دوسری جگہ کر لیں گے۔ جہاں سب معاملات طے ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ابا جان نے اس کا کیا جواب دیا، اور میں تک میں لگی ہوئی تھی کہ کوئی میرے دل سے پوچھے کہ میرا کیا حال ہوا۔

جب ایک روز چپکے سے میں نے ابا جان اور اماں جان کا تصفیہ سن لیا۔ طے ہو کر لکھا جا چکا تھا کی اگر آپ کو ایسی ہی جلدی ہے کہ آپ دوسری جگہ شادی کیئے لیتے ہیں۔ تو بسم اللہ۔ ہم کو لڑکی بھاری نہیں ہے، یہ خط لکھ دیا گیا اور پھر ان کمبخت مجسٹریٹ کی بات ہوئی کہ میں وہاں جھونکی جاؤں گی۔ نہ معلوم یہ آنریری مجسٹریٹ مجھ کو کیوں سخت ناپسند تھے کہ کچھ ان کی عمر بھی ایسی نہ تھی۔ مگر شاہدہ نے کچھ ان کا حلیہ یعنی ڈاڑھی وغیرہ کچھ ایسا بنا بنا کر بیان کیا کہ میرے دل میں ان کے لئے ذرہ بھر جگہ نہ تھی۔ میں گھنٹوں اپنے کمرے میں پڑی سوچتی رہی۔

اس بات کو ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ میں نے ایک روز اسی طرح چپکے سے الماری کھول کر بیرسٹر صاحب کے والد کا ایک تازہ خط پڑھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ خط شاید ابا جان کے آخری خط ملنے سے پہلے لکھا تھا کہ بیرسٹر صاحب کو خود کسی دوسری جگہ جانا ہے اور راستہ میں یہاں ہوتے ہوئے جائیں گے اور اگر آپ کو شرائط منظور ہوئیں تو نسبت بھی قرار دے دی جائے گی۔ اِسی روز اس خط کا جواب بھی میں نے سن لیا۔ انہوں نے لکھ دیا تھا کہ لڑکے کو تو میں خود بھی دیکھنا چاہتا تھا، خانہ بے تکلف ہے۔ جب جی چاہے بھیج دیجئے مگر اس کا خیال دل سے نکال دیجئے کہ سال بھر سے پہلے شادی کر دی جائے۔ اماں جان نے بھی اس جواب کو پسند کیا اور پھر انہی آنریری مجسٹریٹ صاحب کے تذکرہ سے میرے کانوں کی تواضع کی گئی۔

ان سب باتوں سے میرا ایسا جی گھبرایا کہ اماں جان سے میں نے شاہدہ کے گھر جانے کی اجازت لی اور یہ سوچ کر گئی کہ تین چار روز نہ آؤں گی۔

شاہدہ کے ہاں جو پہنچی تو اس نے دیکھتے ہی معلوم کر لیا کہ کچھ معاملہ دگرگوں ہے۔ کہنے لگی کہ ''کیا تیرے بیرسٹر نے کسی اور کو گھر میں ڈال لیا؟''

میں اس کا بھلا کیا جواب دیتی۔ تمام قصہ شروع سے آخیر تک سنا دیا کہ کس طرح وہ جلدی کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد شادی ہو جائے۔ مگر اماں جان راضی نہیں ہوتیں۔ یہ سب سن کر اور مجھ کو رنجیدہ دیکھ کر وہ شریر بولی ''خوب! جھٹ منگنی پٹ بیاہ بھلا ایسا کون کرے گا۔ مگر ایک بات ہے۔''

میں نے کہا ''وہ کیا؟''

وہ بولی ''وہ تیرے لئے پھڑک رہا ہے اور یہ فال اچھی ہے۔''

میں نے جل کر کہا ''یہ تو فال نکال رہی ہے اور مذاق کر رہی ہے۔''

''پھر کیا کروں؟'' شاہدہ نے کہا۔ (کیونکہ واقعی وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی ہے۔)

ہمارے نوجوان اپنے بزرگوں کے حق میں لاکھ سخت گیر سہی لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ صنفِ نازک کے لئے وہ اپنے دل میں بہت نازک جذبات رکھتے ہیں۔ ہم عمر لڑکیوں کی خاطر وہ (جان و مال کے علاوہ) کسی بھی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے اور اس سلسلے میں اپنے اور غیر کی تمیز کے بھی روادار نہیں بلکہ اغیار کے کاشانوں پر تو ان کی رحمریں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ شاید ہم نے اپنے نوجوانوں کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ آج بھی اگر ہم ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئیں تو بڑے بڑے گھمبیر مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں۔ مثلاً اُن کی بے لوث خدمت سے فائدہ اُٹھا کر ٹریفک کا مسئلہ منٹوں میں حل کیا جا سکتا ہے۔

بقلم خود از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

میں نے کہا ''کوئی مشورہ دو۔ صلاح دو۔ دونوں مل کر سوچیں۔''

''پاگل نہیں تو۔۔۔'' شاہدہ نے میری بیوقوفی پر کہا۔ ''دیوانی ہوئی ہے، میں صلاح کیا دوں؟'' ''اچھا مجھے پتہ بتا دے۔ میں بیرسٹر صاحب کو لکھ بھیجوں کہ ادھر تو اس چھوکری پر شار ہو رہا ہے اور ادھر یہ تیرے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے، آ کے تجھے بھگا لے جائے۔''

''خدا کی مار تیرے اوپر اور تیری صلاح کے اوپر۔'' میں نے کہا ''کیا میں اسی لئے آئی تھی؟ میں جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھنے لگی۔

''تیرے بیرسٹر کی ایسی تیسی۔'' شاہدہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا ''جاتی کہاں ہے شادی نہ بیاہ، میاں کا رونا روتی ہے۔ تجھے کیا؟ کوئی نہ کوئی ماں کا جایا آ کر تجھے لے ہی جائے گا۔ چل دوسری باتیں کر۔''

یہ کہہ کر شاہدہ نے مجھے بٹھا لیا اور میں بھی ہنسنے لگی۔ دوسری باتیں ہونے لگیں۔ مگر یہاں میرے دل کو لگی ہوئی تھی اور پریشان بھی تھی۔ گھوم پھر کر وہی باتیں ہونے لگیں۔ شاہدہ نے جو کچھ ہمدردی ممکن تھی وہ کی اور دعا مانگی اور پھر آنریری مجسٹریٹ کو خوب کوسا۔ اس کے علاوہ وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی۔ خود نماز کے بعد دعا مانگنے کا وعدہ کیا اور مجھ سے بھی کہا کہ نماز کے بعد روزانہ دعا مانگا کر۔ اس سے زیادہ نہ وہ کچھ کر سکتی تھی اور نہ میں۔

میں گھر سے کچھ ایسی بیزار تھی کہ دو مرتبہ آدمی لینے آیا اور نہ گئی۔ چوتھے روز میں نے شاہدہ سے کہا کہ ''اب شاید خط کا جواب آ گیا ہوگا اور میں کھانا کھا کے ایسے وقت جاؤں گی کہ سب سوتے ہوں۔ تاکہ بغیر انتظار کئے ہوئے مجھے خط دیکھنے کا موقع مل جائے۔''

چلتے وقت میں ایسے جا رہی تھی جیسے کوئی شخص اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے جا رہا ہو۔ میری حالت عجیب امید و بیم کی تھی۔ نہ معلوم اس خط میں بیرسٹر صاحب کے والد نے انکار کیا ہوگا یا منظور کر لیا ہوگا کہ ہم سال بھر بعد شادی پر رضامند ہیں۔ یہ میں بار بار سوچ رہی تھی۔ چلتے وقت میں نے اپنی پیاری سہیلی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے دبایا۔ نہ معلوم کیوں میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ شاہدہ نے مذاق کو رخصت کرتے ہوئے کہا ''بہن خدا تجھے اس موذی سے بچائے۔ تو دعا مانگ اچھا۔''

میں نے چپکے سے کہا ''اچھا۔''

شاہدہ کے یہاں سے جو آئی تو حسب توقع گھر میں سناٹا پایا۔ اماں جان سو رہی تھیں۔ اور ابا جان کچہری جا چکے تھے۔ میں نے چپکے سے جھانک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا اور دوڑ کر مردانہ زینہ کا دروازہ بھی بند کر دیا اور سیدھی کمرہ میں پہنچی۔ وہاں پہنچی تو ششدر رہ گئی۔

کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بڑا سا چمڑے کا ٹرنک کھلا پڑا ہے اور پاس کی کرسی پر اور ٹرنک میں کپڑوں کے اوپر مختلف چیزوں کی ایک دکان سی لگی ہوئی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ آخر یہ کون ہے، جو اس طرح سامان چھوڑ کر ڈال گیا ہے۔ کیا بتاؤں میرے سامنے کیسی دکان لگی ہوئی اور کیا کیا چیزیں رکھی تھیں کہ میں سب بھول گئی اور انہیں دیکھنے لگی۔ طرح طرح کی ڈبیاں اور ولائتی بکس تھے جو میں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ میں نے سب سے پیشتر جھٹ سے ایک سنہرا گول ڈبہ اٹھا لیا۔ میں اس کو تعریف کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ یہ گنی کے سونے کا ڈبہ تھا اور اس پر سچی سیپ کا نفیس کام ہوا تھا۔ اودی اودی کندن کی جھلک بھی تھی۔ ڈھکنا تو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں موتی جڑے ہوئے تھے اور کئی قطاریں ننھے ننھے سمندری گھونگھوں کی اس خوبصورتی سے سونے میں جڑی ہوئی تھیں کہ میں دنگ رہ گئی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو ایک چھوٹا سا پوڈر لگانے کا پف رکھا ہوا تھا اور اس کے اندر سرخ رنگ کا پاؤڈر رکھا ہوا تھا۔ میں نے پف نکال کر اس کے نرم نرم روئیں دیکھے جن پر غبار کی طرح پاؤڈر کے مہین ذرے گویا ناچ رہے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے یہ کتنا نرم ہے، میں نے اس کو اپنے گال پر آہستہ آہستہ پھرایا اور پھر اس کو واپس اسی طرح رکھ دیا۔ مجھے خیال

چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو بھی رکھ دیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ ایک چھوٹی سے سنہری رنگ کی ڈبیہ پر نظر پڑی۔ اس کو میں نے کھولنا چاہا۔ مگر وہ کمبخت نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ میں اس کو کھول ہی رہی تھی کہ ایک لکڑی کے بکس کا کونہ نظر پڑا۔ میں نے اس کو فوراً ٹرنک سے نکال کر دیکھا۔ یہ ایک بھاری سا خوبصورت بکس تھا۔ اس کو جو میں نے کھولا تو میں دنگ رہ گئی۔ اس کے اندر سے ایک صاف شفاف بلور کا عطردان نکلا جو کوئی بالشت بھر لمبا اور اسی مناسبت

سے چوڑا تھا۔ میں نے اس کو نکال کر غور سے دیکھا اور لکڑی کا بکس جس میں یہ بند تھا، الگ رکھ دیا عجیب چیز تھی۔ اس کے اندر کی تمام چیزیں باہر سے نظر آ رہی تھیں۔ اس کے اندر چوبیس چھوٹی چھوٹی عطر کی قلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کے خوشنما رنگ روشنی میں بلور میں سے گزر کر عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ میں اس کو چاروں طرف سے دیکھتی رہی اور پھر کھولنا چاہا۔ جہاں جہاں بھی جو بٹن نظر آئے میں نے دبائے مگر یہ نہ کھلا۔ میں اس کو دیکھ رہی تھی کہ میری نظر کسی

عقل کریں!

نوید ظفر کیانی

خاتون کو جب دی ہے سخن کی دعوت
مت دیکھا کریں آپ گھڑی کی جانب
یہ پیچھے کیلنڈر ہے بھلا کاہے کو؟

ان کو دیکھا ہی کرے۔

میں ان کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ایک مخمل کے ڈبہ کا کونہ ٹرنک میں ریشمی رومالوں میں مجھے دبا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس کو نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے ناخن کاٹنے اور گھسنے کے اوزار رکھے ہوئے تھے اور ڈھکنے میں ایک چھوٹا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کو جوں کا توں اسی جگہ رکھا تو میرے ہاتھ ایک اور مخمل کا ڈبہ لگا۔ اس کو جو میں نے نکال کر کھولا تو اس کے اندر سے سبز رنگ کا ایک فاؤنٹین پن نکلا۔ جس پر سونے کی جالی کا خول چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو بھی رکھ دیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ ایک چھوٹی سے سنہری رنگ کی ڈبیہ پر نظر پڑی۔ اس کو میں نے کھولنا چاہا۔ مگر وہ کمبخت نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ میں اس کو کھول ہی رہی تھی کہ ایک لکڑی کے بکس کا کونہ نظر پڑا۔ میں نے اس کو فوراً ٹرنک سے نکال کر دیکھا۔ یہ ایک بھاری سا خوبصورت بکس تھا۔ اس کو جو میں نے کھولا تو میں دنگ رہ گئی۔ اس کے اندر سے ایک صاف شفاف بلور کا عطردان نکلا جو کوئی بالشت بھر لمبا اور اسی مناسبت سے چوڑا تھا۔ میں نے اس کو نکال کر غور سے دیکھا اور لکڑی کا بکس جس میں یہ بند تھا، الگ رکھ دیا عجیب چیز تھی۔ اس کے اندر کی تمام چیزیں باہر سے نظر آ رہی تھیں۔ اس کے اندر چوبیس چھوٹی چھوٹی عطر کی قلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کے خوشنما رنگ روشنی میں بلور میں سے گزر کر عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ میں اس کو چاروں طرف سے دیکھتی رہی اور پھر کھولنا چاہا۔ جہاں جہاں بھی جو بٹن نظر آئے میں نے دبائے مگر یہ نہ کھلا۔ میں اس کو دیکھ رہی تھی کہ میری نظر کسی تصویر کے کونے پر پڑی جو ٹرنک میں ذرا نیچے کو رکھی تھی۔ میں نے تصویر کو کھینچ کر نکالا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک مخمل کی ڈبیہ رومالوں اور ٹائیوں میں لڑھکتی ہوئی چلی آئی اور کھل گئی۔

کیا دیکھتی ہوں کہ اس میں ایک خوبصورت انگوٹھی جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ فوراً تصویر کو چھوڑ کر میں نے اس ڈبیا کو اٹھایا اور انگوٹھی کو نکال کر دیکھا۔ بیچ میں اس کے ایک نیلگوں رنگ تھا اور ارد گرد سفید سفید ہیرے جڑے تھے۔ جن پر نگاہ نہ جمتی تھی۔ میں نے اس خوبصورت انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور اپنی انگلیوں میں ڈالنا

چڑی پہاڑ سے اری

لاہور ہمیں اس لیے پسند ہے کہ یہاں لوگوں میں بے ساختگی بہت ہے۔ تصنع بالکل نہیں۔ قواعد و گرامر کا معاملہ صرف سکولوں، کالجوں تک ہے عام آدمی منہ بگاڑ کر نہیں بولتا۔ زبان کو امیٹھا مروڑتا نہیں۔ اسے قدرتی حالت میں رکھتا ہے۔ لہٰذا لفظ دل سے نکلتے ہیں۔ اور زبان تالو اور حلق کے جھٹکے کھائے بغیر سیدھے مخاطب کے دل میں اترتے ہیں۔ سادگی اور صاف گوئی کا یہ عالم ہے کہ جہاں رے کی ضرورت ہو وہاں ڑے استعمال کرتے ہیں۔ زبان کا یہ لطف اور لہجے کی یہ چاشنی ہمیں کسی اور شہر میں نہیں ملتی۔ اسی لیے ہم لاہور اور اس کے لہجے سے پیار کرتے ہیں خاص طور پر اڑشد لہوڑی صاحب سے ہمیں بہت پیار ہے۔ وہ ہمیشہ اپنا نام صاف صاف ارشد لاہوی لکھتے ہیں۔ لیکن بولتے وقت اپنے لکھے کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے ایک دن کہنے لگے۔ اڑدو ہماڑی قومی زبان ہے اوڑ ہماڑا فرض ہے کہ اڑدو کے فڑوغ کے کام کڑیں۔

اکھٹی اتنی ساری ''ڑے'' کی یلغار دیکھ کر ہم پریشان ہو گئے ہم نے کہا۔ ''اڑشد لہوری صاحب۔ بے شک آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ اس فروغ کے سلسلے میں آپ ڑے اور رے کو آگے پیچھے نہ کریں۔

کہنے لگے۔ بہت بہتڑ جناب۔ آپ فکڑ نہ کڑیں۔ میڑی طرف سے اڑدو کی خدمت میں کوئی کسڑ باقی نہیں ڑہے گی۔''

اس طرح تو ہوتا ہے از اعتبار ساجد

شروع کیا۔ کسی میں تنگ تھی تو کسی میں ڈھیلی۔ مگر سیدھے ہاتھ کی چھنگلی کے پاس والی انگلی میں میں نے اس کو زور دے کر کسی نہ کسی طرح تمام پہن تو لیا اور پھر ہاتھ اونچا کر کے اس کے نگینوں کی دمک دیکھنے لگی۔ میں اسے دیکھ بھال کر ڈبیا میں رکھنے کے لئے اتارنے لگی تو معلوم ہوا کہ پھنس گئی ہے۔ میرے بائیں ہاتھ میں وہ بلور کا عطردان بدستور موجود تھا اور میں اس کو رکھنے ہی کو ہوئی تاکہ انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی کو اتاروں کہ ایکا ایکی میری نظر اس تصویر پر پڑی جو سامنے رکھی تھی اور جس کو میں سب سے پیشتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس پر ہوا سا باریک کاغذ تھا جس کی سفیدی میں سے تصویر کے رنگ جھلک رہے تھے۔ میں عطردان تو رکھنا بھول گئی اور فوراً ہی سیدھے ہاتھ سے تصویر کو اٹھا لیا اور کاغذ ہٹا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ سب سامان بیرسٹر صاحب کا ہے کہ یہ انہی کی تصویر تھی۔ یہ کسی ولایتی دکان کی بنی ہوئی تھی اور رنگین تھی۔ میں بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور دل میں کہہ رہی تھی کہ اگر یہ صحیح ہے تو واقعی بیرسٹر صاحب غیر معمولی طور پر خوبصورت آدمی ہیں۔ چہرے کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ سیاہ بال تھے اور آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چہرہ، آنکھ، ناک، غرض ہر چیز اس صفائی سے اپنے رنگ میں موجود تھی کہ میں سوچ رہی تھی کہ میں زیادہ خوبصورت ہوں یا یہ۔ کوٹ کی دھاریاں ہوشیار مصور نے اپنے اصلی رنگ میں اس خوبی سے دکھائی تھیں کہ ہر ایک ڈورا اپنے رنگ میں صاف نظر آ رہا تھا۔

میں اس تصویر کو دیکھنے میں بالکل محو تھی کہ دیکھتے دیکھتے ہوا کی رمق سے وہ کمبخت باریک سا کاغذ دیکھنے میں مخمل ہونے لگا۔ میں نے تصویر کو جھٹک کر الگ کیا۔ کیونکہ بایاں ہاتھ گھرا ہوا تھا۔ اس میں وہی بلور کا عطردان تھا پھر اسی طرح کاغذ اُڑ کر آیا اور تصویر کو ڈھک دیا۔ میں نے جھٹک کر الگ کرنا چاہا۔ مگر وہ چپک سا گیا اور علیحدہ نہ ہوا۔ تو میں نے منہ سے پھونکا اور جب بھی وہ نہ ہٹا تو میں نے "اونہہ" کر کے بائیں ہاتھ کی انگلی سے جو کاغذ کو ہٹایا تو وہ بلور کا عطردان بھاری تو تھا ہی ہاتھ سے پھسل کر چھوٹ پڑا اور چھن سے پختہ فرش پر گر کر کھیل کھیل ہو گیا۔

میں دھک سے ہو گئی اور چہرہ فق ہو گیا۔ تصویر کو ایک طرف پھینک کے ایک دم سے شکستہ عطردان کے ٹکڑے اٹھا کر ملانے لگی کہ ایک نرم آواز بالکل قریب سے آئی "تکلیف نہ کیجئے، آپ ہی کا تھا۔" آنکھ اٹھا کر جو دیکھا تو جیتی جاگتی اصلی تصویر بیرسٹر صاحب کی سامنے کھڑی ہے! تعجب!! اس تعجب نے مجھے سکتہ میں ڈال دیا کہ الٰہی یہ کدھر سے آ گئے۔ دو تین سیکنڈ تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں کہ ایک دم سے میں نے ٹوٹے ہوئے گلدان کے ٹکڑے پھینک دیے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر جھٹ سے دروازہ کی آڑ میں ہو گئی۔

میری حالت بھی اس وقت عجیب قابلِ رحم تھی۔ بلیوں دل اچھل رہا تھا یہ پہلا موقع تھا جو میں کسی نامحرم اور غیر شخص کے ساتھ اس طرح ایک تنہائی کے مقام پر تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ عین چوری کرتے پکڑی گئی۔ سارا ٹرنک کرید کرید کر پھینک دیا تھا اور پھر عطردان توڑ ڈالا، اور نہایت ہی بے تکلفی سے انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے تھی۔ سارے بدن میں ایک سنسنی اور رعشہ سا تھا کہ ذرا ہوش بجا ہوئے تو فوراً انگوٹھی کا خیال آیا۔ جلدی جلدی اسے اتارنے لگی۔ طرح طرح سے گھمایا۔ طرح طرح سے انگلی کو دبایا اور انگوٹھی کو کھینچا۔ مگر جلدی میں وہ اور بھی نہ اتری۔ جتنی دیر لگ رہی تھی، اتنا ہی میں اور گھبرا رہی تھی۔ پل پل بھاری تھا، اور میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہر طرح انگوٹھی اتارنے کو کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ نہ اترتی تھی۔ غصہ میں میں نے انگلی مروڑ ڈالی۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ غرض میں بے طرح انگوٹھی اتارنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں بیرسٹر صاحب نے کہا "شکر ہے کہ انگوٹھی آپ کو پسند تو آ گئی۔"

یہ سن کر میرے تن بدن میں پسینہ آ گیا اور میں گویا کٹ مری۔ میں نے دل میں کہا کہ میں منہ چھپا کر جو بھاگی تو شاید انگوٹھی انہوں نے دیکھ لی۔ اور واقعہ بھی دراصل یہی تھا۔ اس جملہ نے میرے اوپر گویا ستم ڈھایا۔ میں نے سن کر اور بھی جلدی جلدی اس کو اتارنے کی کوشش کی مگر وہ انگوٹھی کمبخت ایسی پھنسی تھی کہ اترنے کا

نام ہی نہ لیتی تھی۔ میرا دل انجن کی طرح چل رہا تھا اور میں کٹی جا رہی تھی اور حیران تھی کہ کیونکر اس نامراد انگوٹھی کو اتاروں۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب آڑ سے ہی بولے ''اس میں سے اگر اور کوئی چیز پسند ہو تو وہ بھی لے لیجئے۔''

میں نے یہ سن کر اپنی انگلی مروڑ تو ڈالی کہ یہ لے تیری یہ سزا ہے، مگر بھلا اس سے کیا ہوتا تھا؟ غرض میں حیران اور زچ ہونے کے علاوہ مارے شرم کے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب پھر بولے ''چونکہ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ مجھے اپنی منسوبہ بیوی سے باتیں کرنے کا بلکہ ملاقات کرنے کا موقع مل گیا ہے لہٰذا میں اس زریں موقع کو کسی طرح ہاتھ سے نہیں کھو سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ دروازہ سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے اور میں گویا گھر گئی۔ میں شرم وحیا سے پانی پانی ہو گئی اور میں نے سر جھکا کر اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر کونہ میں موڑ لیا۔ کواڑ میں گھسی جاتی تھی۔ میری یہ حالت زار دیکھ کر شاید بیرسٹر صاحب خود شرما گئے اور انہوں نے کہا ''میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مگر۔۔۔''

یہ کہہ کر سامنے مسہری سے چادر کھینچ کر میرے اوپر ڈال دی اور خود کمرے سے باہر جا کر کہنے لگے ''آپ مہربانی فرما کر مسہری پر بیٹھ جائیے اور اطمینان رکھیے کہ میں اندر نہ آؤں گا۔ بشرطیکہ آپ میری چند باتوں کے جواب دیں۔''

میں نے اس کو غنیمت جانا اور مسہری پر چادر لپیٹ کر بیٹھ گئی کہ بیرسٹر صاحب نے کہا ''آپ میری گستاخی سے خفا تو نہیں ہوئیں؟''

میں بدستور خاموش انگوٹھی اتارنے کی کوشش میں لگی رہی اور کچھ نہ بولی بلکہ اور تیزی سے کوشش کرنے لگی تا کہ انگوٹھی جلد اتر جائے۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب بولے ''بولیے صاحب جلدی بولیے۔''

میں پھر خاموش رہی۔ تو انہوں نے کہا ''آپ جواب نہیں دیتیں تو پھر میں حاضر ہوتا ہوں۔''

میں گھبرا گئی اور مجبوراً میں نے دبی آواز سے کہا ''جی نہیں!'' میں برابر انگوٹھی اتارنے کی کوشش میں مشغول تھی۔

بیرسٹر صاحب نے کہا ''شکریہ۔ یہ انگوٹھی آپ کو بہت پسند ہے؟''

''یا اللہ!'' میں نے تنگ ہو کر کہا ''مجھے موت دے۔''

یہ سن کر میں دراصل دیوانہ وار انگلی کو نوچنے لگی۔ کیا کہوں میرا کیا حال تھا۔ میرا بس نہ تھا کہ انگلی کاٹ کر پھینک دوں۔ میں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا کہ اتنے میں بیرسٹر نے پھر تقاضا کیا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی اور دل میں کہہ رہی تھی کہ بھلا اس کا کیا جواب دوں۔ اگر کہتی ہوں کہ پسند ہے تو شرم آتی ہے اور اگر ناپسند کہتی ہوں تو بھلا کس منہ سے کہوں۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ ناپسند ہے۔ تو پھر پہنی کیوں؟ میں چپ رہی اور پھر کچھ نہ بولی۔ اتنے میں بیرسٹر صاحب نے کہا۔ ''شکر ہے عطر دان تو آپ کو ایسا پسند آیا کہ آپ نے اس کو برت کر ختم بھی کر دیا۔ اور گویا میری محنت وصول ہو گئی، مگر انگوٹھی کے بارے میں آپ اپنی زبان سے اور کچھ کہہ دیں تا کہ میں سمجھوں کہ اس کے بھی دام وصول ہو گئے۔''

میں یہ سن کر اب مارے غصے اور شرم کے رونے کے قریب ہو گئی تھی اور تمام غصہ انگلی پر اتار رہی تھی، گویا اس نے عطر دان توڑا تھا۔ میں عطر دان توڑنے پر سخت شرمندہ تھی اور میری زبان سے کچھ بھی نہ نکلتا تھا۔

جب میں کچھ نہ بولی تو بیرسٹر صاحب نے کہا ''آپ جواب نہیں دیتیں لہٰذا میں حاضر ہوتا ہوں۔''

میں گھبرا گئی کہ کہیں آ نہ جائیں اور میں نے جلدی سے کہا ''بھلا اس بات کا میں کیا جواب دوں۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کا عطر دان۔۔۔''

بات کاٹ کر بیرسٹر صاحب نے کہا ''خوب! وہ عطر دان تو آپ کا ہی تھا۔ آپ نے توڑ ڈالا، خوب کیا۔ میرا خیال ہے کہ انگوٹھی بھی آپ کو پسند ہے جو خوش قسمتی سے آپ کی انگلی میں بالکل ٹھیک آئی ہے اور آپ اس کو اب تک از راہِ عنایت پہنے ہوئی

ہیں۔‘‘

میں اب کیا بتاؤں کہ یہ سن کر میرا کیا حال ہوا۔ میں نے دل میں خوب انگوٹھی ٹھیک آئی اور خوب پہنے ہوئے ہوں۔ انگوٹھی نہ ہوئی گلے کی پھانسی ہوگئی۔ جو ایسی ٹھیک آئی کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میں نے دل میں یہ بھی سوچا کہ اگر یہ کمبخت میری انگلی میں نہ پھنس گئی ہوتی تو کاہے کو میں بے حیا بنتی اور انہیں یہ کہنے کا موقع ملتا کہ آپ پہنے ہوئے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس نامراد انگوٹھی کو اتارنے کے لیے کیا کیا جتن کر چکی ہوں، اور برابر کر رہی تھی۔ مگر وہ تو ایسی پھنسی تھی کہ اترنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ میں پھر خاموش رہی اور کچھ نہ بولی۔ مگر انگوٹھی اتارنے کی برابر کوشش کر رہی تھی۔

بیرسٹر صاحب نے میری خاموشی پر کہا ’’آپ پھر جواب سے پہلو تہی کر رہی ہیں۔ پسند ہے یا ناپسند۔ ان دو جملوں میں سے ایک کہہ دیجیئے۔‘‘

میں نے پھر غصے میں انگلی کو نوچ ڈالا اور قصہ ختم کرنے کے لیے ایک اور ہی لفظ کہہ دیا ’’اچھی ہے۔‘‘

’’جی نہیں۔‘‘ بیرسٹر صاحب نے کہا ’’اچھی ہے اور آپ کو پسند نہیں تو کس کام کی۔ علاوہ اس کے اچھی تو خود دکاندار نے کہہ کر دی تھی، اور میں یہ پوچھتا بھی نہیں، آپ بتائیے کہ آپ کو پسند ہے یا ناپسند، ورنہ پھر حاضر ہونے کی اجازت دیجیئے۔‘‘

میں نے دل میں کہا یہ قطعی گھس آئیں گے اور پھر جھک مار کر کہنا ہی پڑے گا، لہٰذا کہہ دیا ’’پسند ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں دانت پیس کر پھر انگلی نوچنے لگی۔

’’شکریہ۔‘‘ بیرسٹر صاحب نے کہا ’’صد شکریہ۔ اور اب آپ جا سکتی ہیں۔ لیکن ایک عرض ہے اور وہ یہ کہ یہ انگوٹھی تو بے شک آپ کی ہے اور شاید آپ اس کو پہن کر اتارنا بھی نہیں چاہتی ہیں۔ لیکن مجھ کو مجبوراً آپ سے درخواست کرنا پڑ رہی ہے کہ شام کو مجھ کو چونکہ اور چیزوں کے ساتھ اس کو رسماً بھجوانا ہے لہٰذا اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو اس وقت اس کو یہاں چھوڑتی جائیں۔ میں علیٰحدہ ہوا جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔‘‘

یہ کہہ کر وہ ہٹ گئے۔ اور میں نے ان کے جانے آواز سنی۔ وہ سامنے کے غسل خانے میں چلے گئے۔ دراصل وہ اسی غسل خانے میں کنگھا وغیرہ کر رہے ہوں گے۔ جب میں بے خبری میں آ کر پھنس گئی۔

اب میں سخت چکر میں تھی اور انگلی سے انگوٹھی اتارنے کی سر توڑ کوشش کی گھبراہٹ اور جلدی میں پاگل سی ہو رہی تھی۔ پریشان ہو کر میں نے علاوہ ہاتھ کے، دانتوں سے بھی امداد لی۔ اور انگلی میں کاٹ کاٹ کر کھایا مگر وہ کمبخت انگوٹھی جان لیوا تھی اور نہ اترنا تھی نہ اتری۔ میں نے تنگ آ کر اپنا سر پیٹ لیا اور رو رو کر کہا ’’ہائے میرے اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی۔ یہ کمبخت تو میری جان لیے لیتی ہے۔‘‘

بیرسٹر صاحب غسل خانے میں کھڑے کھڑے تھک گئے اور میں وہیں کی وہیں تھی۔ وہ لوٹ آئے اور بولے ’’معاف کیجیئے نہیں معلوم تھا کہ انگوٹھی اتارنے پر آپ رضامند نہیں اور اس شرط پر جانا بھی نہیں چاہتیں۔ مگر چونکہ اس رسم کا نام ہی انگوٹھی کی رسم ہے، لہٰذا میں اس کی خالی ڈبیہ رکھ دوں گا۔ اور کہلا دوں گا کہ انگوٹھی آپ کے پاس ہے۔‘‘ یہ کہہ کر ذرا رک کر بولے ’’اور تو کسی بات کا خیال نہیں صرف اتنا کہ آپ کے والد اس کو بدقسمتی سے دیکھ چکے ہیں۔‘‘

میں اپنی انگلی توڑ رہی تھی اور یہ سن کر گھبرا گئی۔ یہ تو خیر مذاق تھا کہ وہ کہہ دیں گے انگوٹھی میرے پاس ہے۔ مگر میں سوچ رہی تھی کہ جب ابا جان انگوٹھی دیکھ چکے ہیں تو آخر بیرسٹر صاحب ان سے اس کے بارے میں کیا کہیں گے۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب کو شبہ گزرا کہ میں اس وجہ سے نہیں جا رہی ہوں کہ کہیں وہ غسل خانہ میں سے مجھ کو جاتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔ لہٰذا وہ ایک دم سے بولے ’’اوہو! اب میں سمجھا۔ لیجیے بجائے غسل خانہ کے زینے میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔‘‘

میں بے حد پریشان تھی، مجبور تھی کہ اس غلط فہمی کو جلد از جلد دور کر دوں اور اصل وجہ بتا دوں۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ الٰہی کیا کروں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، تو میرا حال تھا اور بیرسٹر

صاحب نہ جانے کیا خیال کر رہے تھے۔ بالآخر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ زینے میں روپوش ہونے جا رہے ہیں تو مرتا کیا نہ کرتا، تنگ آ کر نہ معلوم میں نے کس طرح دبی آواز میں کہا ''وہ نہیں اترتی۔''

ادھر تو میرا یہ حال تھا اور ادھر بیرسٹر صاحب گویا مارے خوشی کے اچھل پڑے، اور انہوں نے ہنس کر بڑی خوشی کے لہجہ میں جیسے کوئی بے تکلفی سے کہتا ہے، کہا ''واللہ! یہ معاملہ ہے!! خدا کرے نہ اترے۔''

میں بھلا اس جملے کے بعد کیا بولتی۔ اسی طرح چپ تھی۔ اور اپنی بتی کوشش کر رہی تھی کہ انگوٹھی اتر آئے۔ لیکن جب دیر ہوئی تو انہوں نے کہا ''اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں اتار دوں۔''

یا اللہ! میں نے اپنے دل میں کہا۔ اب کیا کروں۔ میں تو نہ اترواؤں گی۔ یہ طے کر کے میں پھر کوشش کرنے لگی۔ مگر توبہ کیجئے وہ بھلا کیوں اترتی۔ اتنے میں بیرسٹر صاحب نے کہا ''وہ آپ سے ہرگز نہ اترے گی۔ کوئی حرج نہیں ہے میں باہر سے اتار دوں گا۔''

میں چونکہ اب تنگ آ گئی تھی اور اس مصیبت سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑوانا چاہتی تھی لہٰذا میں نے مجبوراً ہار کر مسہری پر بیٹھ کر ہاتھ دروازے سے باہر کر دیا۔

بیرسٹر صاحب نے انگلی ہاتھ میں لے کر کہا ''شاباش اس انگوٹھی کو! کیوں صاحب تعریف تو آپ بھی کرتی ہوں گی کہ میں کسی ناپ تول کے ٹھیک ٹھیک انگوٹھی لایا ہوں۔ وہ انگوٹھی ہی بھلا کس کام کی جو یہ تماشا نہ دکھائے۔''

میں مجبور تھی اور چار و ناچار سن رہی تھی۔ مگر اس جملے پر مجھ کو اس مصیبت میں ڈال دیا۔ انگلی کو انہوں نے خوب ادھر ادھر سے دیکھ کر اور دبا کر کہا ''یہ تو پھنس گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اتارنے کی کوشش کرنے لگے۔

ایک دم سے بولے ''اخاہ! معاف کیجئے گا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ اس غریب انگلی پر دانت کس نے تیز کیے ہیں۔؟''

میں نے جھٹ شرمندہ ہو کر ہاتھ اندر کر لیا۔

''لائیے۔ لائیے۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا ''اب میں کچھ نہ کہوں گا۔''

مجبوراً پھر ہاتھ بڑھانا پڑا۔ اور انہوں نے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کرنا شروع کی۔ انہوں نے خوب خوب کوشش کی۔ خوب دبایا، اور وہ بھی ایسا کہ درد کے مارے میرا حال برا ہو گیا۔ مگر وہ دشمن جان انگوٹھی نہ اترنا تھی نہ اتری۔ لیکن وہ بے چارے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے اتنے میں کسی نے مردانہ زینے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیرسٹر صاحب غسل خانے کی طرف چلے کہ ''آج شام نہ سہی کل شام مگر براہ کرم یہ انگوٹھی جس طرح بھی ممکن ہو میرے پاس ضرور پہنچا دیجئے گا۔'' چلتے چلتے وہ ایک ستم کا فقرہ اور کہہ گئے اور وہ یہ کہ "سرخ پاؤڈر کی آپ کو چنداں ضرورت تو نہ تھی۔" میں کٹ ہی تو گئی۔ کیونکہ کم بختی سے ایک گال پر سرخ پاؤڈر لگائے ہوئے تھی جو انہوں نے دیکھ لیا تھا۔

اِدھر وہ غسل خانے میں بند ہوئے اور اُدھر میں چادر پھینک کر سیدھی بھاگی اور اپنے کمرے میں آ کر دم لیا۔ سب سے پہلے آئینہ جو دیکھا تو ایک طرف کے گال پر سرخ پوڈر رنگ دکھار ہا تھا اپنے کو کوستی رہ گئی اور پونچھتی گئی۔ اس کے بعد سب سے پہلے انگلی پر ایک پٹی باندھی تاکہ انگوٹھی چھپ جائے اور بہانہ کر دوں کہ چوٹ لگی ہے۔

خیر سے یہ بہانہ کارگر ہوا اور اماں جان نے چوٹ یا زخم تک کی وجہ نہ پوچھی۔ میں نے سر درد کا بہانہ کر دیا اور وہ ملازمہ سے یہ کہہ کر چپ ہو رہیں ''رہنے دے اس کو منگیتر آیا ہوا ہے۔ شرم کی وجہ سے نہیں نکل رہی۔''

انہیں یا ملازمہ کو بھلا کیا معلوم تھا کہ یہ کمبخت اس سے ملاقات کر آئی ہے اور صرف ملاقات ہی نہیں بلکہ تمام چیزیں اس کی بگاڑ آئی ہے۔

تیسرے پہر کا وقت تھا اور مجھ کو ہر لحہ شاہدہ کا انتظار تھا۔ اس کو میں نے بلوایا تو اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ آج ہی تو میں اس کے

یہاں سے آئی تھی۔ میں نے پھر اس کو ایک خط لکھا تھا کہ ’’بہن خدا کے واسطے جس طرح بھی بن پڑے جلد آ، ورنہ میری جان کی خیر نہیں۔‘‘ اس خط کے جواب میں اس کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔ چنانچہ وہ آئی۔ میں اس کو لینے بھی نہ گئی۔ اماں جان سے کو معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اس کی گھبراہٹ رفع ہوگئی اور ہنستی ہوئی آئی اور آتے ہی اس نے نہ سلام نہ دعا کہا ’’اری کمبخت باہر جا کے ذرا مل تو آ۔‘‘

’’میں تو مل بھی آئی۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا ’’تجھے یقین نہ آئے تو یہ دیکھ۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے انگلی کھول کر دکھائی۔

میں نے شروع سے آخر تک سارا واقعہ تفصیل سے سنایا تو شاہدہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ بولی ’’تو نے بڑی مزیدار ملاقات کی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چٹکیاں لینے کو آگے بڑھی۔ میں نے کہا ’’ملاقات تو گئی چولہے میں، اب اس ناہنجار انگوٹھی کو کسی طرح اتارو، چاہے انگلی کٹے یا رہے۔ مگر تو اسے اتار دے اور اسی لیے تجھے بلایا ہے۔‘‘

اب میں چکرائی کہ یہ کس طرح جائے گی۔ ایسے جانا چاہیے کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ کچھ سوچ کر شاہدہ نے کہا کہ ’’میں پان میں رکھ کر بھیج دوں گی۔ نوکرانی سے کہلوادوں گی کہ یہ پان ان کے ہاتھ میں دینا اور کہہ دینا کہ تمہاری سالی نے دیا ہے۔‘‘

یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ کیونکہ اماں جان یہی خیال کرتیں کہ پان میں کچھ مذاق ہوگا۔ جو نئی بات نہ تھی۔

جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو شاہدہ نے انگوٹھی اتارنے کی کوشش شروع کی۔ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اس کا اترنا آسان کام نہیں ہے، تیل اور صابن کی مالش کی گئی مگر نے کار جب ہر طرح کوشش کر لی تو شاہدہ گھبرا گئی اور کہنے لگی کہ انگلی سوج گئی ہے اور یہ خدا ہی جو اتارے۔ غرض گھنٹوں اس میں کوشش اور محنت کی گئی۔ بورا سینے کا بڑا سوا لایا گیا۔ چھوٹی بڑی قینچیاں آئیں۔ موچنا لایا گیا۔ کاک نکالنے کا پیچ اور مشین کا پیچ کس۔ غرض جو بھی اوزار ممکن تھا لایا گیا اور استعمال کیا گیا مگر سب بے کار۔

رات کو اسی فکر میں مجھ سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ تھک کت میں بیٹھ گئی۔ اور رو رو کر شاہدہ سے کہتی تھی کہ ’’خدا کے لیے کوئی صورت نکال۔‘‘ رات کو گرم پانی میں انگلی ڈبوئی گئی۔ اور طرح طرح سے ڈورے ڈال کو کھینچی گئی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ رہ رہ کر میں پریشان ہوتی تھی اور شاہدہ جب کوشش کر کے تھک جاتی تھی تو یہ کہتی تھی کہ ’’خدا کے واسطے مجھے اس انگوٹھی کی مصیبت سے نکال۔‘‘

’’آخر تو عشق بازی کرنے گئی ہی کیوں تھی؟‘‘ شاہدہ نے خود تنگ ہو کر مجھ سے پوچھا۔

’’خدا کی مار پڑے تمہاری عشق بازی پر۔ میں تو اس مصیبت میں گرفتار ہوں اور تمہیں یہ مذاق سوجھ رہا ہے۔‘‘ میں نے منہ بنا کر کہا۔

’’یہ عشق بازی نہیں تو اور کیا ہے؟ گئیں وہاں اور شوق سے پاؤڈر اور مسی لگاتے لگاتے میاں کے چونچلے میں آ کر انگوٹھی پہن لی۔‘‘ شاہدہ نے کہا ’’اب عشق بازی کے مزے بھی چکھو۔ مزے مزے کی باتیں تو کرنے گئیں، اور اب۔۔۔‘‘

میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر کے کہا ’’خدا کے لیے ذرا آہستہ بولو۔‘‘

’’قینچی سے انگوٹھی کتر دوں؟ نہ بہن کتراؤں گی نہیں۔ نہ معلوم کتنی قیمتی انگوٹھی ہوگی، ایک تو میں شامت کی ماری عطردان توڑ آئی اور اب اسے کاٹ ڈالوں۔‘‘

’’بھلا مجال ہے جو وہ چوں بھی کر جائے۔ ابھی کہلوا دوں، میاں راستہ دیکھو، ہماری چھوکری فاضل نہیں، کہیں اور مانگ کھاؤ۔‘‘ یہ کہہ کر شاہدہ نے قینچی لی، اور مجھ سے کہا ’’لاؤ ادھر لاؤ!!‘‘

’’نہیں نہیں۔‘‘ میں نے کہا ’’ایسا نہ کرو۔‘‘

پھر وہی کوششیں جاری ہوگئیں۔ غرض انگوٹھی نے رات کو سونا حرام کر دیا۔ رات بھی انگلی طرح طرح سے کھینچی گئی، کبھی میں اپنے آپ کو خوب کوستی تھی اور کبھی انگوٹھی کو برا بھلا کہتی تھی۔ اور کبھی گڑگڑا کر دعا مانگتی تھی کہ خدایا میری مشکل آسان کر دے۔

مجبور ہو کر صبح میں نے شاہدہ سے کہا کہ ''اب میری انگلی ویسے بھی درد کے مارے پھٹی جا رہی ہے؛ تو کاٹ دے۔''

شاہدہ نے قینچی سے کاٹنے کی کوشش کی۔ امید تھی کہ سونا ہے اور آسانی سے کٹ جائے گا مگر وہ گنی کا سخت سونا تھا اور تھوڑی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ اس کو کاٹنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ طرح طرح کے اوزار استعمال کیے گئے مگر سب بیکار۔ اب تو میں اور بھی گھبرا گئی اور ایسی حواس باختہ ہوئی کہ شاہدہ سے کہنے لگی کہ مجھے زہر مل جائے تو میں کھا کر اپنا قصہ ختم کر دوں۔

اب شاہدہ بھی متفکر تھی، اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر مجھ سے نرمی سے کہا، کہ ''اب صرف ایک ترکیب ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ ہے۔'' شاہدہ نے مسکرا کر کہا ''وہ یہ کہ تم اوپر جاؤ اور اپنے جیجتے سے نکلواؤ، ورنہ شام تک پکڑی جاؤ گی۔ اور ناک چوٹی کٹے گی۔''

''میں تو کبھی نہ جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''یہ باتیں، اور وہ بھی ہم سے!'' شاہدہ نے کہا ''ذرا دل سے تو پوچھ''

میں نے واقعہ کہا کہ خدا کی قسم میں کسی طرح بھی جانا پسند نہیں کرتی۔ میں اس وقت بدبخت انگوٹھی کی بدلے جان سے بیزار ہو رہی ہوں۔

شاہدہ بولی ''مذاق نہیں کرتی۔ خواہ پسند کرو یا نہ کرو، جانا ضرور پڑے گا۔ کیونکہ گھر کے کسی اوزار سے بھی ناممکن ہے کہ ہم یا تم اسے اتار یا کاٹ سکیں۔''

میں چپ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ شاہدہ نے آہستہ آہستہ سب اونچ نیچ بتائی کہ کوئی نقصان نہیں۔ خاص طور پر جب وہ اس قدر شرمیلے اور باحیا ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا کوئی چارہ ہی نہ تھا اور مجبوراً میں راضی ہو گئی۔

جب سناٹا ہو گیا تو اوپر پہنچی اور شاہدہ بھی ساتھ تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میرا قدم نہ اٹھتا تھا۔ شاہدہ نے مجھے ہٹا کر جھانک کر دیکھا۔ کواڑ کی آواز سن کو بیرسٹر صاحب نکل آئے، کیونکہ وہ شاہد منتظر ہی تھے۔ وہ سیدھے غسل خانہ میں بند ہونے چلے۔ وہ جیسے ہی دروازے کے سامنے آئے، اس شریر شاہدہ کی بچی نے مجھے ایک دم سے آگے کر کے دروازہ تیزی سے کھول کر اندر کو زور سے دھکیل دیا وہ اتنے قریب تھے کہ میں سیدھے اُن سے لڑ گئی۔ وہ اس نامعقولیت کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ''ارے؟'' کہہ کر انہوں نے مجھے ہاتھوں سے روکا۔ وہ خود بے طرح گھبرا گئے۔ میری حالت پر انہوں نے رحم کھا کر منہ موڑ لیا۔ میں کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہوا۔ دروازہ شاہدہ نے بند کر لیا تھا۔ میں سیدھی کمرے میں گھس گئی اور چادر میں کسی اپنے کو لپیٹ کر بیٹھ گئی۔

بیرسٹر صاحب آئے تو سب سے پہلے انہوں نے سلام کر کے زبردستی اندر گھسنے کی دھمکی دے کر جواب لیا اور پھر مزاج پوچھا۔ اس لے جوان میں میں نے ہاتھ دروازہ سے باہر کر دیا۔

''یہ کیا حالت ہے؟'' بیرسٹر صاحب نے انگلی کو دیکھ کر کہا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ انگلی اور انگوٹھی دونوں پر آپ نے عمل جراحی کیا ہے۔''

میں کچھ نہ بولی، اور انہوں نے انگلی کو چاروں طرف سے اچھی طرح دیکھا اور پھر پوچھا ''براہ مہربانی پہلے یہ بتا دیجئے کہ یہ کون شریر ہیں جنھوں نے آپ کو میرے اوپر دھکیل دیا۔ آپ کے لگی تو نہیں؟''

میں نے صرف ایک لفظ کہا ''شاہدہ۔''

''آپ کی کوئی ہجولی معلوم ہوتی ہیں۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا ''ماشاءاللہ ہیں بڑی سیدھی۔''

میں نے دل میں شاہدہ کی شرارت پر ہنسنے لگی۔ کہ دیکھو اس کمبخت نے کیسی شرارت کی۔

''میں صابون لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ صابون لینے گئے۔ مجھ سے کہا بھی نہ گیا کہ صابون کی مالش ہو چکی ہے۔ بیرسٹر صاحب نے صابون سے خوب مالش کی۔ اور پھر طرح طرح سے انگوٹھی

اتارنے کی کوشش کی گئی مگر سب بے سود ثابت ہوئی۔ جب ہر طرح طرح وہ کوشش کر چکے تو تھک کر انہوں نے کہا ''یہ انگوٹھی آپ پہنے رہیے۔ میری قسمت اچھی ہے۔ ورنہ ہزار روپیہ خرچ کرتا جب بھی اس ناپ کی انگوٹھی مجھے نہ ملتی۔''

میں گھبرا گئی اور مجھے شرم آئی۔ بجائے منہ سے بولنے کے میں نے ہاتھ کو جھٹکا کہ گویا اتار دیجیے۔

''اب نہیں اتر سکتی۔'' انہوں نے نہایت لاپروائی سے کہا ''پہنے رہیے۔'' میں سخت گھبرائی اور شرم وحیا اب رخصت کر کے بولی ''خدا کے واسطے میرے اوپر رحم کیجیے۔ اور کوئی تدبیر کیجیے۔ خواہ انگلی کٹے یار ہے۔''

بیرسٹر صاحب بولے۔ ''اتر تو سکتی ہے۔ مگر آپ منظور نہ کریں گی۔''

میں چپ رہی کہ یا الٰہی کیوں نہ منظور کروں گی۔ بیرسٹر صاحب بھی چپ رہے۔ مجبور ہو کر میں نے پھر بے حیا بن کر کہا ''مجھے سب منظور ہے، بس اتر جائے۔''

مجھے قطعی معلوم نہ تھا کہ اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔ وہ یہ سن کر اندر چلے آئے۔ میں چادر میں منہ چھپا کر بالکل سکڑ گئی۔ وہ پلنگ کے سامنے بالکل میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے دراصل اس میں تین ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو منظور ہو تو میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے آہستہ آہستہ صابون لگا کر دباتا ہوں، آپ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اوپر کرنے کی کوشش کریں ورنہ اور کوئی تدبیر نہیں۔

مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے صابون کی مالش کر کے انگلی دبائی اور میں نے انگوٹھی اُتارنے کی کوشش کی۔

میرا سر اور منہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ کیونکہ میں سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی اس لیے میں ٹٹول کو انگوٹھی اوپر کر رہی رہی۔ دو مرتبہ انگوٹھی چکر کھا کر انگلی کی گرہ پر سے لوٹ گئی۔ بیرسٹر صاحب نے جب تیسیر مرتبہ دیکھا کہ میں کہیں کی کہیں سرکاتی ہوں تو انہوں نے کہا ''آپ کو تو انگوٹھی اتروانے کے لیے سب منظور ہے کیونکہ اس کام میں تین ہاتھوں کے علاوہ دراصل چار آنکھوں کی بھی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے یہاں صرف دو ہی کام کر رہی ہیں۔ مگر آپ کو سب منظور ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک جھٹکے سے میری چادر اتار لی اور کھینچ کر اس کو الگ پھینک دیا۔ میں سمٹ سی گئی اور میں نے اپنا منہ گود میں چھپا کر چادر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''یہ کہہ کر وہ واقعی بالکل نیچی نظر کر کے پھر سے کوشش کرنے لگے۔ میں پھر چادر کی طرف بڑھی تو انہوں نے انگلی گھسیٹ کر روکا اور کہا ''آپ دوسرا ہاتھ منہ پر رکھے ہیں، کیا میری قسم کا آپ کو اعتبار نہیں؟ بخدا میں آپ کو ہرگز نہ دیکھوں گا۔''

یہ انہوں نے اسی طرح کہا جیسے کوئی برا مان کر کہتا ہے۔ میں نے مجبوراً ہاتھ ہٹا کر، انگلی کو دبانا شروع کیا۔ مگر کیا کہوں میرا کیا حال تھا۔ حالانکہ وہ میری طرف بالکل نہیں دیکھ رہے تھے اور دیدہ و دانستہ ضرورت سے زیادہ گردن جھکائے تھے مگر پھر بھی میں سمٹی جا رہی تھی، دونوں ہاتھ علیحدہ تھے اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چہرہ کدھر لے جاؤں۔

لیکن یہ حالت تھوڑی ہی دیر رہی۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ آپ تو اتارنے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتی ہیں۔ میں سب گویا بھول کو کوشش کرنے لگی۔

دونوں کی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن میں رہ رہ کر اپنی نظریں انگوٹھی پر سے ہٹا کر بیرسٹر صاحب کی کشادہ پیشانی اور صاف شفاف جھکے ہوئے چہرے پر بھی ڈالتی تھی۔ کبھی میں ان کے پپوٹوں کو دیکھتی اور کبھی کبھی لمبی لمبی پلکوں کو دیکھتی تھی۔۔۔۔ مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ جب میں ایسا کرتی ہوں تو میرا ہاتھ کام کرنے سے خود بخود رک جاتا ہے اور جو شخص غور سے انگلی اور انگوٹھی کی طرف دیکھ رہا ہے وہ آسانی سے بغیر میرے چہرے کو دیکھے ہوئے معلوم کر سکتا ہے کہ میری آنکھیں اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے ہمت کر کے بیرسٹر صاحب کے چہرے کو غور سے نظر بھر کر دیکھا، وہاں میرا ہاتھ معطل ہو گیا تو بیرسٹر صاحب نے مجبوراً تنگ آ کر کہا ''مجھے آپ بعد میں فرصت میں دیکھ لیجیے گا۔ اس وقت براہ

کرم ادھر دیکھیئے۔" یہ کہہ کر انہوں نے میری انگلی کو جھٹکا مجھے اس قدر شرمندگی معلوم ہوئی کہ میں نے جھٹ اپنا منہ اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی سے چھپالیا۔

بیرسٹر صاحب نے کہا "اچھا معاف کیجئے۔" اور یہ کہہ کر اسی طرح نیچی نظر کیے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر کام میں لگا دیا۔

پھر میری ہمت نہ پڑی کہ بیرسٹر صاحب کی طرف دیکھوں اور بڑے غور سے میں نے اپنی انگوٹھی اتروانے کی کوشش کی۔ خوب خوب ہم دونوں نے کوشش کی۔ مگر وہ دشمن جان نہ اترنا تھی نہ اتری۔ جب بیرسٹر صاحب زچ آگئے اور کوئی امید نہ رہی تو انہوں نے ہاتھ روک لیا اور اسی طرح نظر نیچی کیے ہوئے بولے "یہ نہیں اتر سکتی، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ نے یہ کس مقصد سے پہنی تھی؟"

میں جھینپ گئی اور میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی سے اپنا منہ چھپالیا۔

بیرسٹر صاحب نے کہا "بس ایک سوال کا جواب دے دیجئے، تو ابھی آپ کو خلاصی مل جائے۔ وہ یہ کہ آپ صرف یہ بتا دیں کہ آخر قبل از وقت آپ نے اسے کیوں پہن لیا؟" ہاتھ کو انہوں نے آہستہ سے جھٹک کر کہا "بولیے۔"

میں کچھ نہ بولی تو انہوں نے کہا "تو پھر آپ جانیں اور آپ کا کام، میں صرف اسی شرط پر مشکل آسان کر سکتا ہوں۔"

میں نے بڑی کوشش سے زبان ہلائی۔ کہا "یونہی۔" میں اپنی آنکھوں کے گوشہ سے کہنی کی آڑ سے بیرسٹر صاحب کے خوبصورت چہرہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔۔ ان کی لمبی لمبی سیاہ پلکیں بدستور اسی طرح زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔

اُنہوں نے میرا جواب سن کر نہایت ہی سادگی سے کہا۔ "آپ کے والد صاحب قبلہ تو سال بھر کا وقت مانگتے ہیں۔ مگر شکر ہے کہ آپ خود۔۔۔" اُنہوں نے شاید میرے اوپر رحم کیا کہ جلد پورا نہ کیا۔ گو کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ ایک دم سے بات بدل کر بولے "آپ کے جواب کا شکریہ، اب عرض یہ ہے کہ انگوٹھی کٹ کر اترے گی اور مجھ کو بازار سے جا کر خود ریتی لانا پڑے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی طرف رخ کر کے دیکھنے لگے۔ میں نے موقع کو غنیمت خیال کر کے چادر قبضے میں کر کے اپنے اوپر ڈال لی۔ مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ ایک چھوٹی سی ریتی میں اس چھوٹے سے بکس میں دیکھی تھی جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ناخن کترتے اور گھسنے اوزار رکھے تھے۔ میں بولنے ہی کو تھی کہ بیرسٹر صاحب نے کہا "میں اس مقام سے واقف نہیں؛ مگر جاتا ہوں اور کہیں نہ کہیں سے ریتی ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ آپ مناسب خیال کریں تو اندر چلی جائیں۔" یہ کہہ کر وہ کھونٹی کی طرف اپنی ٹوپی لینے بڑھے۔

میں نے ہمت کر کے صرف کہا کہ "ہے۔"

"کہاں ہے۔" بیرسٹر صاحب نے مڑ کر پوچھا۔

میں نے جواب میں ٹرنک کی طرف انگلی اٹھا دی۔

"میرے ٹرنک میں؟" بیرسٹر صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا "میرے ٹرنک میں؟"

"جی!" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"کم از کم ابھی تک تو مجھے ریتی اور پھاوڑے سوٹ کیس میں رکھنے کی ضرورت پڑی نہیں۔ آئندہ خدا مالک ہے۔ وہ اور بات ہے کہ جب آپ۔۔۔" اتنا کہہ کر رک گئے لیکن میں سمجھ گئی کہ خواہ مخواہ کی چوٹ مجھ پر کستے ہیں۔ بولے کہ تو آپ پھر تکلیف کر کے نکال بھی دیں۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ میرے پاس کوئی ریتی یا پھاوڑہ نہیں ہے۔

اُٹھنا تو پڑتا ہی۔ یہ سوچ کر کہ اس بھلے آدمی کو ذرا قائل ہی کر دوں، میں اٹھی۔ انہوں نے بڑھ کر سوٹ کیس کو کھول دیا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ کر اور چیزیں الٹ پلٹ کر وہ بکس نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔

"اوہو! بے شک اس میں ضرور ہوگی۔ معاف کیجیے گا۔ آپ نے خود ہی تو میرے ٹرنک کا جائزہ لیا ہے، مگر دیکھ لیجیے، پھاوڑہ نہیں ہے۔"

ان کی آنکھیں واقعی اسی طرح تھیں کہ میں آزادی سے بار بار

دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ بے چارے قسم کھانے کو بھی پلک نہ اٹھاتے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ کتنے اچھے اور شرمیلے شخص ہیں۔

بکس میں سے ایک لمبی سی سیپ کے دستہ کی نازک سی ریتی نکلی اور بیرسٹر صاحب نے کہا ''اگر اب تین ہاتھ اور چار آنکھیں کام میں لگیں تو بس پانچ منٹ کا کام ہے۔'' چونکہ کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے بہت دیکھ بھال کے اپنی انگلی اچھی طرح پکڑ لی، اس طرح کہ انگوٹھی نہ ہٹ سکے اور بیرسٹر صاحب نے ایک باریک اور تیز ریتی سے اس ظالم انگوٹھی کو کاٹنا شروع کیا۔ دراصل اس کا ریتنا بھی دشوار ہو رہا تھا کیونکہ اِدھر اُدھر انگلی کا گوشت ابھرا ہوا تھا۔ بیرسٹر صاحب انگوٹھی کاٹنے میں مشغول تھے اور میں کمبخت آنکھ کے گوشے سے ان کی لمبی لمبی پلکیں اور صاف وشفاف پیشانی دیکھ رہی تھی۔ انگوٹھی کو کاٹتے کاٹتے بیرسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا ''آپ نے مجھ کو اچھی طرح دیکھا ہے؟''

میں نے کچھ جواب نہ دیا تو انہوں نے کہا ''تو پھر کام چھوڑے دیتا ہوں ورنہ جواب دیجیے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ روک لیا۔

مجھ کو جلدی ہو رہی تھی اور میں سمجھی کہ یہ سوال اسی جواب پر ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا میں نے کہہ دیا ''جی ہاں۔'' یہ کہہ کر میں شرما گئی۔

بیرسٹر صاحب نے کہا ''مگر میں نے اب تک آپ کو نہیں دیکھا ہے سوائے ایک جھلک کے۔ اور وہ بھی محض اتفاقاً۔''

دراصل یہ واقعہ تھا کہ مجھے انہوں نے ایک مرتبہ بھی نظر بھر کر نہ دیکھا تھا حالانکہ ان کو میں برابر دیکھتی رہی تھی۔ جس سے انکار ہی نہ کر سکتی تھی۔ میں چپ ہو رہی اور کچھ نہ بولی۔ انگوٹھی ذرا سی رہ گئی تھی اور بیرسٹر صاحب نے ہاتھ روک کر اسی طرح نظر نیچی کئے ہوئے کہا ''اتنی محنت میں نے مفت کر دی۔ لیکن اب میں بغیر مزدوری لئے قطعی نہیں کر سکتا۔ وعدہ کیجیے۔ کیونکہ یہ تو بے انصافی ہے کہ آپ مجھ کو دیکھ لیں اور میں نہ دیکھوں۔''

میں چپ رہی اور چادر سے منہ کو اچھی طرح چھپانے لگی کہ انہوں نے انگلی بھی چھوڑ دی۔ مجھ کو سخت جلدی ہو رہی تھی اور میں نے پریشان ہو کر کہا ''خدا کے واسطے۔''

''بس۔ بس۔۔۔ یہ لیجئے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے چشم زون میں انگوٹھی کو کاٹ کر نکال دیا اور میری جان میں جان آئی۔

''میری مزدوری۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا۔

میں نے اور بھی چادر میں منہ چھپالیا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک جھٹکے سے چادر کو منہ سے الگ کر دیا۔

سیدھا ہاتھ میرا پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ کی کہنہ اپنے منہ پر رکھ لی۔

''یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔'' بیرسٹر صاحب بولے ''اگر آپ کو کافی فرصت ہے تو بسم اللہ! اسی طرح بیٹھی رہیں۔''

میں سخت گھبرا رہی تھی اور سر زمین کی طرف جھکائے ہوئے کہنی سے منہ چھپائے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیسے جان چھڑاؤں، سیدھا ہاتھ تو وہ پکڑے ہی تھے، انہوں نے کہا ''معاف کیجئے گا۔'' اور یہ کہہ کر میرا بایاں ہاتھ جس سے منہ چھپائے تھی، میرے منہ سے ہٹا دیا۔ مجبوراً میں نے اپنا منہ کندھوں اور گریبان اور اپنی گود میں چھپانے کی کوشش کی۔ تو انہوں نے ہاتھ چھوڑ کر اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر کو کی تو میں نے پھر اپنا ہاتھ آزاد پا کر اس سے چہرہ ڈھک لیا۔ زچ ہو کر بیرسٹر صاحب نے کہا ''کاش کہ میرے تین ہاتھ ہوتے۔'' قصہ مختصر وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتے تو میں گود میں منہ چھپا لیتی اور ہاتھ چھوڑ کر میرا سر اوپر کرتے تو میں ہاتھ سے چھپا لیتی۔

تنگ آ کر بیرسٹر صاحب نے کہا ''اب دیر ہو رہی ہے۔ خواہ کچھ ہی ہو آپ کو نجات اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ آپ ایمانداری سے میری مزدوری نہ چکا دیں۔ مجبوراً اپنی جان چھڑانے کے لئے میں نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھ چہرے پر نہ لے گئی۔ میں نے آنکھیں کھولی تو ان کو اپنے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے پایا اور دوسرا ہاتھ بھی جھٹک کر میں نے چھڑا لیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر چادر کو اکٹھا کر کے جانے کے لئے سرکی۔

میں چلنے ہی کو تھی کہ انہوں نے نرم آواز میں کہا ''ٹھہریے۔''
میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ سوٹ کیس میں سے کوئی چیز نکال رہے تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا اور اس میں سے ایک سونے کی گھڑی نکال کر میری کلائی پر باندھی اور کہا ''بقیہ چیزیں شام کو۔'' اتنا کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ کر ذرا جھٹک کر کہا ''ہمیں بھولو گی تو نہیں؟''

میں کچھ نہ بولی۔ مگر اپنی کہنی اور چادر کی آڑ سے ان کے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کیا کہوں کہ اس جملہ کا میرے دل پر کیسا اثر ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ الفاظ دل سے کہے تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے پھر یہی کہا اور جب میں پھر کچھ نہ بولی تو بائیں ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا ''خدا کے واسطے بھولو گی تو نہیں۔''

میں نے سر ہلا کر بتایا کہ نہیں بھولوں گی۔ وہ جھکے ہوئے تھے اور میری آنکھیں چادر کے کونے سے چار ہوئیں۔ کیونکہ میں کمبخت پھر جھانک رہی تھی۔ میرا یہ سر ہلانا بس غضب ہی تو ہو گیا۔ ایک ہاتھ تو میری ٹھوڑی پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے بے خبری میں انہوں نے جھٹک کر میرا ہاتھ چہرے سے الگ کر دیا ''بھولنا مت بھولنا مت، بھولنا مت۔'' خدا کی پناہ! میری آنکھیں بند ہو گئیں اور سانس رک گئی۔

جس طرح بھی بن پڑا میں اس مصیبت سے اپنی جان چھڑا کر بھاگی اور تیر کی طرح دروازے میں گھس گئی۔

''اری یہ کیا؟ یہ کیا؟'' شاہدہ نے مجھے بے ترتیب اور حیران دیکھ کر کہا ''یہ کیا؟''

میں نے بن کر کہا ''کچھ نہیں، ہوتا کیا؟''

شاہدہ بولی ''خالہ آئی تھیں اور پوچھتی تھیں۔''

میں سن سی ہو گئی اور گھبرا کر میں نے کہا ''پھر تم نے کیا کہہ دیا۔''

شاہدہ نے نہایت سادگی سے کہا ''کہتی کیا؟ میں نے کہہ دیا کہ شہد کھا رہی ہے ابھی آتی ہے۔''

''خدا کی مار تیرے اوپر، تو نے مجھے دہلا دیا!''

وہ بولی ''ذرا مجھے بتا تو سہی کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔ کمبخت۔۔۔''

میں نے بات کاٹ کر کہا ''ہم نہیں بتاتے!'' یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹا۔ کمرہ میں آئی اور اسے وہ گھڑی دکھانے لگی۔ جو بیرسٹر صاحب نے تحفتاً پہنا دی تھی۔

شاہدہ نے اس میں کوک بھری اور پھر کان سے لگا کر کہنے لگی ''اب تو نے بیرسٹر کو پھانس لیا۔ اور وہ سال بھر چھوڑ! دو سال انتظار کرے گا، مگر کرے گا تجھی سے۔''

شام کو تمام دوسری چیزیں مثلاً پوڈر کا ڈبہ اور دوسری ڈبیاں وغیرہ وغیرہ مع انگوٹھی کے آئیں۔ نہ معلوم کس سے اس قدر تھوڑے وقت میں بیرسٹر صاحب نے انگوٹھی کو اس صفائی سے جڑوایا کہ سوائے شاہدہ کے کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ ابا جان کو بیرسٹر صاحب نے پھسلا کر راضی کر لیا اور وہ سال بھر کے بجائے چھ مہینے پر آ گئے۔

بیرسٹر صاحب دو مہینہ بعد پھر آئے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور مجھ سے ملنا چاہتے ہوں گے، بلکہ شاید اسی امید پر آئے ہوں گے۔ مگر میں جھانکنے تک نہ گئی۔ کچھ تحفہ وغیرہ بھجوا کر چلے گئے۔

چھ مہینوں میں سے چار مہینے تو گزر گئے ہیں اور دو مہینے باقی ہیں۔ کچھ بھی ہوا، اچھا یا برا، مگر اُس انگوٹھی کی مصیبت کو عمر بھر نہ بھولوں گی۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی (۳۰ر دسمبر ۱۹۲۸ تا ۱۷ر فروری ۲۰۰۹) بدایوں (بھارت) میں پیدا ہوئے اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی (پاکستان) منتقل ہو گئے اور ساری زندگی یہیں گزاری۔ ان کا قلمی نام ''شبنم رومانی'' تھا۔ ادبی مجلّے ''اقدار'' کے مدیر رہے اور روزنامہ مشرق میں کالم نگاری کرتے رہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں جزیرہ، تہمت، مثنویٔ سیر کراچی، دوسرا ہمالہ، ہائیڈ پارک وغیرہ شامل ہیں۔ فکاہی افسانہ نگاری میں کمال رکھتے تھے۔

قندِ شیریں

سیّد عارف مصطفیٰ

میرا کمپیوٹر

یہ جو آجکل میں تلملایا سا رہتا ہوں اِس کی زیادہ ذمہ داری نہ تو میری اہلیہ پر ہے نہ بچوں پر اور نہ ہی امریکا روس یا نواز شریف، زرداری و الطاف حسین پر، بلکہ اس کی وجہِ خاص صرف اور صرف میرا کمپیوٹر ہے۔ حاسدوں کا گمان ہے کہ کمپیوٹر کی ایجاد کے وقت جو دو چار نمونے بنے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہے، کوئی ۲۰ برس پہلے جب میں نے اسے لیا تھا، تب اچھی طرح چیک نہیں کر سکا تھا، کیونکہ دکاندار اسے خریدتے وقت پیہم میری قسمت پہ رشک کیئے جا رہا تھا اور اس کی بار بار کی تحسین سے میں اک حالتِ سرور میں پہنچا ہوا تھا، اس وقت مناسب پڑتال نہ کر سکنے کے باعث میں ان حاسدوں کے دعوے کو اب یکسر مسترد بھی نہیں کر سکتا۔ چند برس تک تو اس نے عاجزی دکھائی اور کوئی زیادہ کام نہیں نکالا لیکن اس کے بعد سے تو کمپیوٹر کی مرمت کرنے والے بھائی مشتاق کے پاس آوت جاوت لگی ہی ہوئی ہے، کبھی تو یہ وقفہ بہت کم رہ جاتا ہے جسے میرے گھر والے ٹیکنیکل جلاب کا نام دیتے ہیں۔

اب تو گزشتہ کچھ عرصے سے یہ جب بھی مرمت کو گیا ہے، یوں لگتا ہے کہ گویا مرمت میری ہوئی ہے۔۔۔ بدگمانی ہے کہ اس کے اعضائے رئیسہ میں سے ہر بار چند کام کی چیزیں کھینچ لی جاتی ہیں اور باقی تاریخی اعضا کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاتا حالانکہ اسے چوری کی بھرپور پروفیشنل اور جامع نیت سے چیک کیا جائے تو اب بھی اس میں چند ایسے قابلِ لحاظ پرزے پناہ گزین ہیں جو چور کے ساتھ جانے کو بیتاب ہوں گے، ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب بھی مرمت کو جاتا ہے ایک دو نئے پرزے لگوائے بنا واپس نہیں آتا۔ کاریگر کہتا ہے پہلے والے پرزے تو محض اخلاقی سہارے کے لئے ہیں،، ورنہ تو بقول شاعر

یہ کشتی خدا کے سہارے چلی جا رہی ہے

یا پھر کسی حد تک اس کی کارکردگی کا انحصار اُن نئے پرزوں پر ہے۔۔۔ لیکن میں بھی کوئی دیوانہ ہوں کہ ایسی گمراہ کن باتوں پہ یقین کر لوں۔

پہلے تو میں اسے برائے مرمت مشتاق کی دکان پہ خود لے کر جاتا تھا مگر اب وہ مرمت اور مذمت دونوں ساتھ ساتھ کرتا ہے اور یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ زیادہ طاق کس میں ہے، وہ ہر بار یہ بتانا بھی نہیں بھولتا کہ اب تک کی مرمت کے پیسوں سے میں ایسے کتنے اور عجوبے خرید سکتا تھا۔۔۔ اسی طرح بیگم بھی پرانی چیزوں سے جان چھڑانے کا مفت مشورہ دینے کو بیتاب رہتی تھیں لیکن ایک دن جب میں نے بڑے رسان سے انہیں یہ باور کرایا کہ اگر ایک بار

مجھے پرانی چیزوں سے جان چھڑانے کا چسکہ لگ گیا تو پھر نجانے اس کی زد میں کیا کیا نہ آجائے گا، بس تبھی سے اس رات دن کے مشورے سے افاقہ ہے۔ مشتاق بھی یہ سب کہتا ضرور ہے لیکن اسے بھی واضح طور پر اس مشین سے دیرینہ وابستگی کی بنا پر کچھ انسیت سی ہو چلی ہے اسی لیئے اگر مجھے کبھی اس کی دُکان کا رخ کیئے زیادہ دن ہو جائیں تو کبھی ملنے کو بھی آجاتا ہے اور مجھ سے زیادہ کمپیوٹر کی خیریت دریافت کرتا ہے۔

میرا یہ تاریخی کمپیوٹر بنئے کو لے جایا جاتا ہے تو بار بار کی مرمت کے سبب اب خجالت آمیز پردہ داری سے کسی اور کے سنگ دعاؤں کے جلو میں رخصت کرتا ہوں۔ میری اہلیہ کی بدگمانی ہر بار یہی ہوتی ہے کہ اب کے واپس نہ آئے گا اور آخری ہچکی کے بعد وہیں دفنایا جائے گا۔۔ مگر ہر بار اس کی مناسب رفو گری اس کی مجھ سے رفاقت کی مدت بڑھائے جاتی ہے۔

اس کمپیوٹر کے ساتھ میری دیرینہ وابستگی نہ ہوتی تو اسے کب کا پھیری والے کے حوالے کر چکا ہوتا جو اس مقصد کے لیئے پہلے بہت چکر لگاتا تھا اور ہر بار میرے انکار پہ اس کی شان میں جاتے جاتے ایسی ایسی گستاخیاں کر بیٹھتا تھا اور ملاحیاں سناتا تھا کہ میرا خون کھول کھول اٹھتا تھا اور پھر میں اس کے جاتے ساتھ اک بارگی یہ بھول جاتا تھا کہ مجھے ایک شریف آدمی سمجھا جاتا ہے لیکن اب تو پھیری والے نے بھی آنکھیں پھیر لی ہیں اور وہ میرے گھر کے سامنے سے یوں ساکت و بے آواز گزرتا ہے جیسے کسی مردہ خانے یا قبرستان کے پاس سے گزر رہا ہو۔

جہاں تک بات کمپیوٹر کی کارکردگی کی ہے تو وہ بتائے نہ بنے اور چھپائے بھی نہ بنے، کیونکہ عین اس وقت سب کچھ اسکرین سے لاپتا ہو جاتا ہے کہ جب بیحد مطلوب ہو، رک رک کے چلتا ہے اور چل چل کے رکتا ہے، یوں بجلی اور خون ایک ساتھ پیتا ہے، جب رواں ہوتا ہے تو اس قدر دھیمی چال سے کہ اس دوران آپ کئی دیگر بکھیڑے بھی ساتھ ساتھ نمٹا سکتے ہیں، بہت سے سپر ایکسپریس کمپیوٹروں کے زمانے میں یہ گویا اک کمپیوٹرانہ مال گاڑی ہے۔ ویسے تو یہ جلد بازی کی تاب نہیں رکھتا لیکن اکثر گوہرِ مراد جب ہاتھ آنے کے قریب ہو تو یکا یک اک عجب سی ہڑبڑاہٹ کے ساتھ بند ہو جاتا ہے۔۔۔ گویا ''اِن بلٹ'' احتسابی

سی پی یو کی نہیں، ڈیو ہے ظفرؔ
اَپ گریڈیشن میرے ہی بھیجے کی

میکلوڈ روڈ پر ایک دکان نظر آئی جس کا نام ''ادویات و ادبیات'' ہے۔ اس دکان میں ٹنکچر اور مکسچر خمیرہ اور لعوق۔ جوارش اور لعوب کے ساتھ ساتھ افسانہ، ڈرامہ، غزل، قصیدہ، مثنوی موجود ہیں۔ ایک طرف دیوانِ غالب، بانگِ درا، شعر العجم اور آبِ حیات ہیں تو دوسری طرف جوارشِ جالینوس، معجونِ فلاسفہ، لعوبِ کبیر اور دواء المسک، ایک جانب میرا جی کا کلام ہے، دوسری طرف ٹنکچر آیوڈین۔ ادویات اور ادبیات بڑی ان مل اور بے جوڑ چیز معلوم ہوتی ہے یعنی ان میں کوئی معنوی قسم کا تعلق تو بالکل نہیں البتہ ظاہری تعلق ضرور ہے، یعنی ادبیات اور ادویات دونوں ہم قافیہ ہیں، پھر ان میں تجنیسِ خطی بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکان کے مالک کوئی حکیم جلال لکھنوی قسم کے بزرگ ہیں جو طبیب کم ہیں اور شاعر زیادہ، بیچارے دوائیں بیچتے بیچتے تجنیسِ خطی، رعایتِ لفظی اور ایطاء کے پھیر میں پڑ گئے ہیں اور اس سے آج تک نہیں نکل سکے ہیں۔

حرف وحکایت از چراغ حسن حسرت

صلاحیتوں کا بھی حامل ہے۔

مرے کو مارے شاہ مدار، یہ کہ ہم نے جو نیٹ کیبل لگوایا ہے وہ انہی اوصاف سے معمور ہے۔ دونوں کی حرامزدگی میں بلا کا اتفاق ہے۔ زیادہ تر باری باری مائل بہ سرکشی رہتے ہیں۔ ایک حاضر ملتا ہے تو دوسرا مفقود، دونوں کی رفتار ایسی ہے کہ ابتدائی ریلوے کے معلوم ہوتے ہیں۔ اک ذرا کہیں ابر چھا جائے اور بجلی کوند جائے تو نیٹ سروس ڈر کر کیبل سے دفعتاً کود جاتی ہے اور اگر نوبت بارش کی ہو تو پھر تو معاملہ ''تیرے دونکیا کی نوکری میرا لاکھوں کا ساون جائے'' تک جا پہنچتا ہے۔ ساون میں ہم اور کچھ نہیں کرتے محض کیبل والے اور بھائی مشتاق کو یاد کرتے رہتے ہیں، گو اس سرمئی رومانویت میں ان کی یاد آنا انتہائی ناموزوں ہے، یہ یورپی معاشرہ نہیں، ساون میں مردوں کو یاد کرنا مشرق میں خاصا معیوب ہے اور معروف شریفوں کا شیوہ نہیں۔ ویسے ہمارا کمپیوٹر اپنی بیماریوں کے لئے اک ساون ہی پہ انحصار نہیں کرتا بلکہ بارہ مہینے دستیاب رہتا ہے۔ کبھی کبھی جب یہ بھائی مشتاق کی دکان پہ زیادہ طویل استراحت کرتا ہے تو ایک ہم ہی نہیں کئی اور بھی ہمیں مانگ اجڑی سہاگن جیسا محسوس کرنے لگتے ہیں۔۔۔ یا مریل مردانہ محاورے سے کہیں تو اک عجیب رنڈاپا سا ہر طرف چھایا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

بات یہ نہیں کہ ہم کوئی دوسرا کمپیوٹر خریدنے کے متحمل نہیں، لیکن اس کے ساتھ بتائی ہوئی ہماری جوانی کے آخری دن تو ہماری سنہری یادوں کا سرمایہ ہیں۔ ہمیں اس پہ کیسے کیسے پیغام ہمیں ملے ہیں کہ بس نہ پوچھیئے۔۔۔ اک آگ سی لگ جائے پانی میں۔۔۔ یہ سب یادگار ہے گویا اور اسی سبب یہ دل فگار ہے گویا۔۔۔ پھر یہ کہ یہ بہت سی کہی، ان کہی کا رازدار بھی تو ہے، اور اسی سبب اس سے اتنا پیار بھی تو ہے۔ جو شب بیداریاں عابد و زاہد لوگ کیسے کیسے وعظ سنا کر نہ کرا سکے، وہ سب اس کے سبب ہوئیں، کتنی خوبصورت گھڑیاں، جو کسی اور کو نصیب ہوتی تھیں، بس اسی کے سنگ ہوئیں۔۔۔ پھر ایک وصف اس میں اور ہے کہ آپ مان جائیں، شاید اسی کے سبب ہم سیدھے سبھاؤ جنت میں جائیں گے۔۔۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں ہم نے اکثر صبر و استقامت کا بہت کڑا درس پایا ہے۔۔۔ بس یوں سمجھئے کہ صابرین کے سنگ، داخلِ جنت ہونے کا زبردست نسخہ ہاتھ آیا ہے۔

سیّد عارف مصطفیٰ کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک دردِ دل رکھنے والے بلاگر ہیں۔ خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں اِن کی مساعی جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں بھی اِن کا خاصا ہاتھ ہے، کراچی جیسے آلام زدہ شہر میں فکاہی مجالس برپا کرنا انہیں کا کام ہے۔ ارمغانِ ابتسام کے لئے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

نورم خان

چار گز کا چمچہ

اِن بدیسیوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم دیسیوں کو کبھی آگے نہ بڑھنے دیں گے مگر ہماری بے خبری کا یہ عالم ہے کہ وہ ہماری معمولی ایجادات و دریافت سے لے کر گھریلو چٹکلوں پر بھی خاموشی سے ہاتھ صاف کر جاتے اور کچھ عرصے بعد اپنا کارنامہ بنا کر دنیا والوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ حالانکہ انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی ایک ایک چیز کی اصل ہمارے پاس موجود ہے مگر ہماری ہر روایتی چیز معمولی ردوبدل کے بعد کسی اور نام سے سامنے لانے پر وہ بالکل نہیں شرماتے۔

مثال کے طور پر گڑ ہی کو دیکھ لیں۔ کون نہیں جانتا کہ جب سے ہمارے کسان گنّے کی کاشت کر رہے ہیں اس وقت سے ہم گڑ بنا رہے ہیں۔ لیکن گوروں نے اسے گوری شکل دے کر چینی کا نام دے دیا اور لگے اِترانے کہ چینی انہوں نے بنائی ہے۔ اگر ہم گڑ کی بنیاد نہ فراہم کرتے تو دیکھتے کہ وہ چینی کیسے بناتے؟ اور تو اور ایک ارب سے زائد آبادی والے چینی بھی انکے شرمندۂ احسان نہیں۔ انکی قابلِ رشک آبادی بھی انکی ذاتی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

انہیں ہماری چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کے علاوہ ایک اور ضد بھی ہے۔ انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہماری ہر دیسی چیز اپنائیں گے مگر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ! تاکہ ان ہتھکنڈوں سے ہماری تہذیب وثقافت پر قابض بھی ہو جائیں اور ہمیں پتہ بھی نہ چلے۔ اب گدھے کو ہی دیکھ لیں۔ ابتدائے آفرینش سے ہم اسے ''گدھا'' ہی سمجھتے آئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے ہمارے بے شمار معاشی اور معاشرتی مسائل حل ہوتے ہیں۔ بار برداری سے لیکر ''باعزت'' سواری تک کے لئے استعمال کرنے کے علاوہ بہتوں کے لئے اسکا نام تک استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ رال ٹپکائے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن چالاکی یہ کی کہ اسے اپنے معاشرے میں غیر ضروری اونچی حیثیت دے دی۔ اپنا انتخابی نشان تک بنا ڈالا۔ بھلا بتلائیں ہمارے دیسی گدھوں میں اس سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی ہے' اس کا کسی کو اندازہ ہے؟

بعینہٖ الّو کو دیکھیں۔ ہمارا بچہ بچہ جانتا ہے کہ الّو کسے کہتے ہیں۔ سبھوں کو پتہ ہے کہ اُلّو بنانا ہمارے یہاں آرٹ کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جو مقام گدھے کا جانوروں میں ہے وہی الّو کا پرندوں میں ہے۔ لیکن انہیں تو ہماری ہر چیز پر ہاتھ صاف کرنا ہے سو اسکا بھی انہوں نے یہی حل نکالا کہ ہم مشرقیوں کے رد میں اسے علم ودانش کا مظہر قرار دے دیا۔ اب وہاں جو جتنا بڑا الّو ہے اتنا ہی بڑا دانشور بھی ہے۔ پتہ نہیں اگر یہی خیالات ہمارے یہاں رواج پا جائیں تو ہمارے دانشوروں کے کیا جذبات ہونگے!

اور ہمارا اونٹ! ایک طرح سے یہ ہمارا قومی جانور ہے۔

سب ہی جانتے ہیں کہ یہ جب سے دنیا میں آیا ہے'صحرا کا جہاز کہلاتا رہا ہے۔ اسکے مقابلے میں فولادی جہاز بنانا کونسی اِترانے والی بات ہے؟ جب سے تیل کی قیمتیں صبح وشام بڑھنے لگی ہیں' شدید احساس ہونے لگا ہے کہ کاش ہم اس صحرائی جہاز تک ہی محدود رہتے ۔ بیشک نام اس کا صحرائی جہاز ہے مگر شہروں اور دیہاتوں میں بھی چلنے پر اسے کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے بھی آبادی ختم ہوتے ہی صحرائی علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ اسکے علاوہ اس کے پاؤں اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ چھوٹے موٹے ندی نالوں سے بھی بآسانی گذر جاتا ہے۔ سواری کو اس پر بیٹھنے کے بعد چند ہلکے پھلکے جھٹکوں کے سوا اُن جان لیوا لمحات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو فولادی جہاز میں بیٹھنے سے ممکن ہیں۔ ذرا انجن میں خرابی آئی تو یا تو سیدھے جنت رسید ہوئے یا پھر دریا بُرد۔ یعنی امان نہ ہوائی جہاز میں ہے نہ بحری جہاز میں۔ اس کے علاوہ اسے چلانے میں فیول کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک بار پانی پی لے تو ہفتوں چل سکتا ہے۔ راستے میں اُگے جھاڑ جھنکاڑ سے ذاتی توانائی پیدا کر لیتا ہے۔ اور سواری کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ''اوگرا'' کسی چڑیا کا نام ہے۔

کہتے ہیں ایک پندرہ سالہ بچہ چیسٹر گرین استادوں کے مرغا بنانے کی عادت سے تنگ آکر اسکول چھوڑ گیا تھا۔ بعد میں اس نے میدان جنگ میں دھاکوں اور گولیوں کی وحشت ناک آوازوں سے پردہ سماعت کی حفاظت کے لئے ایک آلہ ایجاد کرکے ۱۸۷۷ء میں پیٹنٹ کرالیا۔ یہ آلہ جنگ عظیم اول میں سپاہیوں کے بہت کام آیا۔ اسے انکے ہیلمٹ کے اندر لگا دیا جاتا تھا اور یوں وہ بیرونی شور شرابے سے بے خبر بآسانی موت کو گلے لگا لیتے تھے۔ اپنی اس ایجاد سے اس نے ''واہ واہ'' کے علاوہ لاکھوں کمائے۔ لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ دیکھے کہ جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں اپنے آباء و اجداد کی طرح بیرونی شور شرابے سے بچنے کے لئے کانوں میں ایک بہت ہی سادہ سی چیز یعنی روئی ٹھونستے رہے ہیں اور اگر وقت پر یہ بھی دستیاب نہ ہو تو صرف انگلیاں بھی کام آجاتی ہیں۔ مگر پیسہ تو دور' آج تک کسی نے چھوٹے منہ تعریف تک نہ کی۔ اب آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ کیسے ہماری چیزوں کو معمولی ردوبدل کے بعد اپنے نام سے پیش کردیتے ہیں اور ہمارے نادان ہم وطن بلا سوچے سمجھے اس پر سر دُھننے لگتے ہیں۔

اور اب تو حد ہوگئی ہے۔ بلغاریہ کا ایک بڑھئی چار گز کا چوبی چمچہ بنانے میں جُتا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس نئی حرکت سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام درج کرالے' ہم اپنے بڑوں کو ہوشیار کررہے ہیں کہ وہ عالمی سطح پر اس مسئلے کو اٹھائیں۔ اقوام متحدہ جائیں۔ عالمی عدالتِ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ اس بار یہ نہیں ہونا چاہئے۔ چھوٹی موٹی باتوں سے تو ہم صرفِ نظر کرتے رہے ہیں لیکن اس بار یہ قومی مسئلہ بن چکا ہے۔ آپ نے بھی حال ہی میں کچھ چمچوں اور کفگیروں کا تذکرہ سنا ہوگا۔ بطور چمچہ جو لوگ منظورِ نظر تھے' اب انہیں کفگیر نہ بنانے پر افسوس کا اظہار کیا جارہا ہے اور ایک دوسرے پر خوب طعنہ زنی ہورہی ہے کہ شاید اس طرح بات بن جائے۔ بقول غالب:

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب؟
تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

چونکہ چمچہ و کفگیر بننے اور بنانے والے ہمارا قومی اثاثہ بن چکے ہیں اس لئے ہمیں اس مسئلے پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس بلغارین بڑھئی کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ہمارے دو دو گز کے چمچوں کو نیچا دکھانے کے لئے چار گز کا چمچہ بنائے اور ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتا جائے کہ عنقریب وہ اسے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کرائے گا......؟ بقول ''روزنامہ ڈان'' ابھی اسکی ''چمچہ سازی'' تکمیل کے مراحل میں ہے سو اب بھی وقت ہے کہ کوئی اسے روکے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی!

نورم خان (نور محمد خان) کا تعلق کراچی سے ہے۔ طنز و مزاح ان کا میدان ہے۔ نثرِ لطیف میں نہایت شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ اخبارات میں طویل عرصہ سے مضامین اور کالم نگاری کے ''مرتکب'' ہورہے ہیں۔ فیس بک پر طنز و مزاح پر مبنی ایک گروپ کے منتظمِ اعلیٰ بھی ہیں۔ برقی مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

ساجدہ غلام محمد

دیارِ غیر میں

لیں جی، ہم بابل کے دیس سے پیا کے دیس، یعنی پاکستان سے براستہ دبئی مانچسٹر (برطانیہ) پہنچ ہی گئے۔ سارے سفر میں ہمارا ننھا سا دل مستقبل کے انجانے خدشوں کے ساتھ ساتھ ہوائی سفر کے خوف سے لرزتا رہا۔ نو گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے جہاز کے منہ سے ہم اور ہمارے منہ سے یہ کپکپاتا ہوا جملہ نکلا ''اف، یہاں تو بہت سردی ہے!''

سردی لگتی بھی کیوں ناں، ہم اکتوبر کے مہینے کی پاکستانی گرمی کو چھوڑ کر برطانوی ٹھنڈ میں آ گئے تھے اور سونے پہ سہاگہ کہ میاں جی کو بھی خیال نہ رہا کہ منزل کے آغاز پہ نہ سہی، منزل پہ پہنچ کے تو سردی لگے گی تو کوئی سویٹر ہی رکھ لیتے!!! وہ تو صد شکر کہ گھر والے ائرپورٹ پر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور گھر سدھارے۔ ایک دو دن کے بعد سفر کی تھکن اتری تو اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور آج تک جائزہ ہی لیتے آ رہے ہیں۔ یہاں کی دنیا بھی نرالی اور لوگ بھی نرالے۔ لو بھلا بتاؤ، ہر سڑک کے دونوں اطراف میں ایک جیسی گلیاں اور ہر گلی میں ایک جیسے گھر۔ بندہ گھبرا کے کسی اور کے گھر نہ گھس جائے تو اور کیا کرے؟ اور اس پہ مزید یہ کہ گھر پہ کوئی نیم پلیٹ بھی نہیں، بس گھر کا نمبر یاد ہو یا پھر میاں جی کا (میاں جی کے فون کا، کچھ اور نہ سمجھیں!)، تا کہ گم ہونے کی صورت میں روہانسی آواز میں انہیں فون کیا جا سکے۔

''جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں''، یہ محاورہ انسانوں پہ لاگو ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، پاکستان اور برطانیہ کے موسموں پہ ضرور لاگو ہوتا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں، پاکستان میں بادل آتے ہیں، گرج گرج کے دلوں کو سہاتے ہیں اور ایک بوند بھی گرائے بغیر کسی بے وفا معشوقہ کی طرح سر اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ اور برطانیہ کا موسم!!! جتنی خاموشی سے بارش برستی ہے، شائد ہی کہیں اور برستی ہو۔ آپ اگر گھر کے اندر ہوں تو اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ باہر کیسی جھڑی لگی ہے بارش کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں (برطانیہ) کا موسم اور محبوبہ دونوں ہی بے وفا ہیں۔ محبوبہ کا تو پتا نہیں لیکن موسم جی بھر کے بے وفا ہے۔ آپ صبح اٹھ کے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہیں اور چمکتی دھوپ اور صاف آسمان دیکھ کر کسی پکنک کے لیے پارک جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ باہر نکلتے وقت آپ کا چھتری کی طرف بڑھتا ہاتھ پلٹ کر واپس آجاتا ہے کہ آج تو دھوپ نکلی ہے، چھتری کی کیا ضرورت!!! آپ یقین کریں، یہ سنگین غلطی آپ کو بہت مہنگی پڑے گی!!! اور غالب امکان ہے کہ کچھ ہی دیر بعد جب آپ پارک میں چادر بچھا کر کھانے پینے کی چیزیں سجا رہے ہوں گے تو مینہ برسنا شروع ہو جائے گا، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے! یہ دھوکہ موسم اس وقت بھی دیتا ہے جب آپ سردی کی وجہ سے گرم کپڑوں سے لیس ہو کر گھر سے نکلتے ہیں اور کچھ دیر بعد گرمی سے بوکھلائے بوکھلائے واپس آتے ہیں۔ یہاں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر سے نکلتے وقت آپ کے پاس چھتری ضرور ہو، ورنہ نقصان کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے!

یہاں آپ کسی کو گھور نہیں سکتے۔ اس قانون کی وجہ سے ہمارے میاں تنگ ہیں اور ہم خوش۔ کوئی آپ کو کتنا عجیب یا مضحکہ خیز کیوں نہ لگ رہا ہو، کوئی کتنی ہی بڑی آفت کی پرکالہ جا رہی ہو، آپ نے اسے گھورا نہیں اور اس نے پولیس کو شکایت لگائی نہیں! اور پولیس بھی فوراً کسی جن کی طرح سائرن بجاتی ہوئی کسی کونے سے نمودار ہو کر آپ کو جرمانہ لگا دے گی جو آپ کو ہر حال میں ادا کرنا ہی کرنا ہے، چاہے وہ جرمانہ پچاس پاؤنڈ ہی کیوں نہ ہوں، وہ آپ کو جرمانے کے نوٹس پہ نوٹس بھیجیں گے یہاں تک کہ آپ جرمانہ ادا کر کے اپنی جان چھڑوا نہیں لیتے۔ قانون سب کے لیے برابر ہے، اگر آپ نے ''نو پارکنگ'' والی جگہ پہ گاڑی پارک کی اور خود شاپنگ کرنے چلے گئے تو واپس آنے پر آپ کے لیے ایک تحفہ منتظر ہوگا!!! آپ کی گاڑی پہ جرمانے کا نوٹس۔ اور اگر آپ اپنا جرم ماننے سے انکار کر دیں تو پولیس آپ کو آپ کی

اُن اکے لئے، جن کی روح کی غذا موسیقی ہے۔

ہمارے ہاں تانگہ وہ واحد سواری ہے جس کا چالان کرتے ہوئے پولیس بھی گھبراتی ہے کیونکہ تانگے کو اگر تھانے میں لے جا کر بند کر دیا جائے تو پولیس والے گھوڑے کی ٹہل سیوا کرتے کرتے ''پھانویں'' ہو جائیں۔

مزاج بخیر از تنویر حسین

گاڑی کی تصویر دکھا دے گی جو اس نے ثبوت کے طور پر کھینچی ہو گی!!!

برطانیہ کے لوگ بھی ہم جیسے ہیں، کوئی آسمان سے تو اترے نہیں کہ قانون کو قانون سمجھیں۔ قانون پہ عمل درآمد نہ ہو تو یہاں کے لوگ بھی وہی کریں جو ہم اپنے ملک میں کرتے ہیں!! لیکن یہاں سختی ہے، اور قانون ایسے ہیں کہ آپ جتنی کوشش کر لیں، اس سے دور نہیں بھاگ سکتے۔ مثال کے طور پر آپ کسی بھی شاپنگ سینٹر میں چلے جائیں (جیسے پاکستان میں یوٹیلٹی سٹور)، بلڈنگ کے آغاز میں ہی ٹرالیوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ اور ہر ٹرالی ایک زنجیر کے ذریعے دوسری ٹرالی سے منسلک ہے۔ اگر آپ کو خریداری کا سامان رکھنے کے لیے ٹرالی کی ضرورت ہے تو ٹرالی کی زنجیر پہ بنی جگہ پہ ایک پاؤنڈ کا سکہ رکھیں، آپ کا پاؤنڈ زنجیر کے پاس اور اس کی ٹرالی آپ کے پاس آ جائے گی۔ اب آپ جتنی دیر چاہے شاپنگ کریں اور ٹرالی بھرتے جائیں لیکن خیال رکھیے گا کہ خراماں خراماں ٹرالی گھسیٹتے آپ شاپنگ سینٹر کے پارکنگ ایریے سے باہر ہی نہ چلے جائیں۔ دو باتیں ہوں گی، ایک تو بل ادا کیے بغیر جانے پہ سیکورٹی الارم خود ہی چیخ پڑے گا، دوسرا آپ کی ٹرالی ایک قدم بھی آگے بڑھنے سے انکار کر دے گی! اگر آپ نے بل ادا کیا بھی ہوا ہے، پھر بھی آپ ٹرالی کو ایک ''سند'' کی صورت گھر لے جانے سے قاصر رہیں گے، وجہ وہی کہ ہر شاپنگ سینٹر کی ٹرالیاں اس کے علاقے سے باہر قدم (بلکہ اپنے پہیے) رکھنے سے قاصر ہیں، گوروں نے پکا بندوبست کیا ہوا ہے ورنہ شائد ایک بھی ٹرالی شاپنگ سینٹر میں نہ ہوتی۔ ارے اس ایک پاؤنڈ کو تو ہم بھول ہی گئے جو آپ نے ٹرالی کے بدلے زنجیر کے حوالے کیا تھا!!! یہاں ہم یہ بتا دیں کہ پاؤنڈ کی قدر و قیمت کیا ہے! آپ ایک پاؤنڈ میں سادہ چکن برگر کھا سکتے ہیں، فلش صاف کرنے کا برش لے سکتے ہیں یا بغلوں کو مہکانے کے لیے خوشبو بھی خرید سکتے ہیں۔ اس لیے کون اپنا پاؤنڈ زنجیر کے حوالے کر دے!!! آپ واپس اسی جگہ جائیں گے جہاں سے آپ نے ٹرالی مستعار لی تھی، زنجیر کو ٹرالی سے منسلک کریں گے اور کھٹ کی آواز کے ساتھ پاؤنڈ آپ کے اور ٹرالی زنجیر کے حوالے۔ یہ طریقہ ہمیں تو بہت اچھا لگا کیونکہ اس طرح نہ تو ہوا کے زور پہ ٹرالیاں اِدھر اُدھر بھاگتی نظر آتی ہیں اور نہ ہی چوری ہوتی ہیں۔ اس طریقے کی ضرورت ہمیں کراچی ائر پورٹ پہ بے تحاشا محسوس ہوئی جہاں سامان لوڈ ہو جانے کے بعد مسافر حضرات اک ادائے بے نیازی سے ٹرالی کو بیچ راہ میں چھوڑ کر دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بن رہے تھے!!!

ویسے تو گوروں کے پاس عقل بے شمار ہے لیکن دو موقعوں پہ شائد گھاس چرنے چلی جاتی ہے! ایک ان کے گھر اور دوسرا، گھروں میں لگے نل! رخصتی سے پہلے جب فون پہ ہمارے میاں ہمیں برطانیہ کے گھروں کا حجم بتانے کے لیے انہیں مرغی کے دڑبوں سے تشبیہ دیتے تھے تو ہم حیرت سے اپنے چچا کے گھر بنے مرغی کے دڑبے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھتے تھے، 'ہیں، واقعی؟؟' اب یہی سوال ہماری بہنیں اور سہیلیاں کرتی ہیں جب ہم انہیں اپنے گھر کا حدود اربعہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں، بھلا یہ کیا گھر ہوا جس میں سامان رکھنے کو دیوار پہ لگی کوئی الماری نہ ہو، کوئی سٹور نہ ہو، کمرے میں ڈبل بیڈ رکھ کے سوچنا پڑے کہ الماری کی جگہ کیسے بنائیں، ٹوائلٹ جانا ہو تو اندر کیسے داخل ہوں، اگر شومئی قسمت کپڑے بچا کے اندر داخل ہو بھی گئے تو نکلیں کیسے!!! یقین کریں، ہمیں ایک ہسپتال کے ٹوائلٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اندر تو چلے گئے، باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہ سجھائی دے کہ کپڑے فلش پہ بھی نہ لگیں اور فلش کے عین سامنے لگا دروازہ بھی کھول لیں، بڑی سوچ بچار کی، ایک طرف کھڑے ہو کر دروازہ کھولتے ہیں تو دروازے تک پہنچنے کے لیے فلش آڑے آتا ہے۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر کوشش کریں تو دروازہ کسی

صورت نہیں کھلتا!!! آخر تنگ آکر ہم نے فلش کے اوپر کھڑے ہو کر دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگائی۔۔۔گوروں کی عقل کو مزید سراہنا ہے تو کچن اور غسل خانے کے نل دیکھ لیں، آپ کی طبیعت عش عش کرا ٹھے گی!! پاکستان میں تو ٹھنڈا اور گرم پانی آپ ایک نل کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہاں گرم پانی کا الگ نل، ٹھنڈے پانی کا الگ! ٹھنڈا کھولیں تو یخ ٹھنڈا پانی آئے۔ گرم کھولیں تو جہنم کی یاد ذہن میں تازہ ہو جائے!!! گورے لوگ تو سنک بند کر کے ٹھنڈا اور گرم نل کھول کے اسی میں سارے برتن انڈیل دیتے ہیں (یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ دھوتے کیسے ہیں)۔ غسل خانے میں بھی یہی کام کر کے پانی بھرے سنک میں ہی تمام کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں لیکن مسئلہ تو ہمیں ہوا، اور بہت ہوا۔ اصل میں یہاں کا ہیٹنگ سسٹم بھی پاکستان کے گیزر کی طرح کا سمجھ لیں، بس یہاں ہیٹنگ سسٹم چلانے کے لیے کسی ماچس کی ضرورت نہیں پڑتی، صرف ایک بٹن گھمانے سے آپ پانی کا درجۂ حرارت کنٹرول کر سکتے ہیں۔۔ پاکستان میں تو اگر آپ نے گیزر چلایا ہے تو گرم پانی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پانی کا نل کھول کر اپنی ضرورت کے مطابق درجۂ حرارت حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہاں دونوں نل الگ الگ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات بہت کوفت ہوتی ہے۔ اگر پانی کا درجۂ حرارت تیز کیا گیا ہے تو ہر جگہ تیز گرم پانی ہی آئے گا۔ اس لیے اگر کوئی نہا رہا ہو تو کسی بھی جگہ کا نل کھولنے پہ پابندی ہوتی ہے، کہ نہانے والا نکلے گا، پانی کا درجۂ حرارت کم کرے گا، تبھی آپ نارمل درجۂ حرارت پہ برتن دھو سکیں گے!!!!

یہاں آ کے ہم نے ترقی کی دوڑ میں بھارتیوں کو آگے آگے اور پاکستانیوں کو ذرا پیچھے پیچھے ہی دیکھا اور سچ مانیے تو ہمیں بہت ہی بُرا لگا۔ آپ گوروں کے بڑے بڑے سپر سٹورز میں چلے جائیں، آپ کو بھارتی کمپنیوں کے مصالحے، چٹنیاں اور آٹے کے تھیلے آرام سے مل جائیں گے۔ جب بھی ہم خریداری کرنے جاتے، حسد کے مارے جلتے بھنتے واپس آتے لیکن ایک دن دل میں ٹھنڈک اتر گئی جب ہم نے ایک بہت بڑے سپر سٹور پہ نیشنل اور شان کے مصالحہ جات دیکھے!! لیکن ابھی بھی پاکستانی کمپنیوں کو اپنی جگہ بنانے کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ خریدنے والے بہت ہیں، بس آپ کوشش جاری رکھیں!!

لیکن ایک شعبے میں پاکستانیوں نے اپنی دھاک بٹھا ہی لی ہے!! وہ ہے ہوٹلنگ کا شعبہ۔ مانچسٹر میں تو ایک سڑک کا نام ''curry mile'' رکھ دیا گیا ہے کیونکہ ایک میل تک سڑک کے دونوں جانب کھانے پینے کے چھوٹے بڑے ایشین ہوٹل بنے ہیں اور ان ہوٹلوں کے اندر ایشین کی بجائے گورا لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جی ہاں، ہم نے انہیں بھی اپنے ذائقوں کا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کانوں سے دھواں نکل رہا ہے، سوں سوں کر کے ناک صاف کر رہے ہیں لیکن پھر بھی بریانی ضرور کھانی ہے، برگر بھی چٹپٹا ہو اور ساتھ میں مرچیلی چٹنی تو ضروری ہے! اب تو ان کے گھروں

بیٹھا کہیں اللہ نہ ہو!

''صہبا'' ایک درویش صفت مگر بامذاق شاعر تھے۔ اکبرؔ الہٰ آبادی کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دن اکبرؔ نے کہا ''بھائی صاحب، نمازِ عشاء محلہ کی مسجد میں پڑھ لیا کیجئے، میں بھی آجایا کروں گا۔ اس کے بعد دونوں اُٹھ کر گھر چلے جائیں گے، ذرا لطفِ صحبت رہے گا۔''

صہبا نے جواب دیا ''ضرور، ضرور!''

مگر عشاء کا ذکر کیا، صہبا فجر تک نہ چونکے۔ کچھ دن چڑھے آئے تو شرمندہ سے، کہنے لگے ''بندہ نواز۔۔۔ معاف کیجئے گا، میں عشاء کی نماز میں شریک نہ ہو سکا، مسجد میں پہنچا تو لق و دق عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔۔۔ وہ وحشت، وہ ویرانی کہ الاماں والحفیظ۔

اکبرؔ اک ذرا خاموش ہوئے، مسکرائے اور اسی وقت یہ شعر کہہ دیا ؎

شیخ جی رات کو مسجد میں نہیں جاتے ہیں
یعنی۔۔۔ ڈرتے ہیں کہ بیٹھا کہیں ''اللہ'' نہ ہو

میں بھی ہمارے مصالحہ جات کے ڈبے مل جاتے ہیں۔شائد یہ بھی اُبلے ہوئے مٹر، آلو اور پالک وغیرہ کھا کھا کے تنگ آ گئے ہیں۔ ہمارے میاں جی کی گاڑی ایک دن خراب ہوگئی۔ باوجود کوشش کے سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ یہ صورتحال دیکھ کے ہمارا گورا ہمسایہ مدد کرنے کو پہنچا اور کچھ ہی دیر میں گاڑی سٹارٹ ہوگئی۔ میاں نے ازراہِ مروت پوچھ لیا کہ کوئی کام ہے تو بتائیں۔ ہمسایے نے فوراً بریانی کی فرمائش کر دیا اور اگلے دن بہت مزے لے لے کے کھائی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب یہ بیچارے انگریزی لہجے میں دیسی کھانوں کے نام لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ویٹر بیچارے منہ چھپا کے بمشکل ہنسی چھپاتے ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے ہمیں نجانے کیوں وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے جس میں ایک گورے نے بڑی حیرت سے جلیبیاں بنانے والے سے کہا تھا کہ تم لوگ اس ٹیوب میں رس کیسے بھرتے ہو۔۔۔

ایک نامور پاکستانی نیوز چینل کے مشہور دعوے 'ہر جگہ، ہر وقت، سب سے پہلے۔۔۔ نیوز' کی بدولت پاکستان کی پل پل کی خبریں ہم تک پہنچتی رہتی ہیں اور ہم دل تھامے کڑھتے رہتے ہیں۔ ایک دن بجلی کے بحران پر میاں جی نے ایک حل بتایا اور واقعی کیا خوب بتایا۔ یہاں بجلی کا بل ادا کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ مہینے بعد گھر پہ بجلی کا بل آجایا کرے (جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے) اور دوسرا طریقہ یہ کہ آپ کے پاس موبائل کارڈ کی طرح کا ایک کارڈ ہوتا ہے جس میں آپ کسی بھی پٹرول سٹیشن یا دکان پہ جا کر بیلنس ڈلواتے ہیں اور گھر آ کے وہ کارڈ بجلی کے میٹر میں لگا دیتے ہیں۔ یہ بیلنس دس پاؤنڈ کا بھی ہو سکتا ہے اور سو پاؤنڈ کا بھی۔ جب بیلنس ختم ہونے لگے تو کارڈ نکالیئے اور دکان پہ جا کے دوبارہ بھروا لیجیئے ورنہ آپ بھی کہیں گے، 'اوہ، بجلی چلی گئی!' اور بجلی تب تک نہ آئے گی جب تک دوبارہ بیلنس بھرا کارڈ میٹر میں نہ لگ جائے۔۔ ہماری رائے میں پاکستان میں بھی یہی دوسرا طریقہ متعارف ہونا چاہیے۔ پھر نہ کسی میٹر ریڈر کو گھر گھر جا کے میٹر چیک کرنا پڑے گا اور نہ ہی کنڈے کے ذریعے کوئی بھی گھر مفت میں بجلی کے مزے لے سکے گا!!! تجویز بری نہیں ہے!

دلوں کے حال تو اللہ ہی جانے، لیکن یہاں آپ کو ہر جگہ مساوات ضرور نظر آئے گی۔ کوئی حجاب میں ملبوس کسی خاتون کو کچھ کہہ نہیں سکتا، کسی کو نوکری سے اس لیے نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کی داڑھی کیوں ہے، اور نہ ہی کسی کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیازی سلوک کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یورپ کے سب سے بڑے کینسر ہسپتال میں کام کرنے کا موقع ملا اور وہاں بھی ہم نے یہی بات دیکھی کہ آپ چاہیں کسی بھی رنگت اور نسل کے ہوں، آپ کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا۔ بلکہ ایک دفعہ تو ہم عید کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو باہر ایک تنظیم کے کچھ انگریز ہمیں عید کی مبارک باد دینے کے لیے کھڑے تھے!!! اتنا کھلا دل بہت کم اقوام کے پاس ہے اور برطانوی قوم اس معاملے میں شائد سب سے آگے ہے۔ اب تو یہاں سکولوں میں عید کی چھٹی بھی دی جانے لگی ہے لیکن مسئلہ پھر وہی دو عیدوں کا!!! جی ہاں، یہ مسئلہ صرف پاکستان میں نہیں پایا جاتا بلکہ شائد جہاں جہاں پاکستانی پہنچتے ہیں، یہ مسئلہ بھی پہنچتا ہے!!!

لیکن کچھ بھی ہو، جب یہاں گرمیوں میں دوپہر ڈھلتی ہے تو پاکستان میں لگے آموں کے بور کی خوشبو اس دیارِ غیر میں بے چین کر کے رکھ دیتی ہے، کان یہ آواز سننے کو ترس جاتے ہیں، 'فالسے لے لو' اور ہم پاکستانی بار بار ایشین سپر سٹورز کے چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں، 'کہ بھائی، پاکستانی آم کب آئیں گے؟؟' یا جب برف پڑ رہی ہو تو پاکستان کی مونگ پھلیاں بے تحاشا یاد آتی ہیں، ساگ، مکھن اور مکئی کی روٹیاں یاد آتی ہیں، کینو یاد آتے ہیں اور اپنے آتے ہیں، اور اپنے تو ہمیشہ ہی یاد آتے ہیں!!!

ساجدہ غلام محمد کا تعلق پاکستان سے ہے لیکن کئی برسوں سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ کہانیاں لکھنے میں کمال رکھتی ہیں۔ بچوں کے ادب سے لگاؤ ہے۔ اندازِ تحریر نہایت جاندار اور شگفتہ ہے۔ اپنے انگلینڈ میں موجود واقعات کو نہایت چلبلے اور بیساختہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی خصوصی کرمفرما ہیں۔

مراد علی شاہدؔ

دھرنا کلچر

جب عادت وسابق اس ویک اینڈ پر بھی یاران ہم نوالہ سے خوش گپیوں اور شیرازی کی دعوتِ شیراز سے لطف اندوز ہوتے ہوتے قدرے زیادہ ہی تاخیر سے گھر قدم رنجہ فرما ہوا تو بیوی بچہ کو جاگتا پا کر محوِ حیرت ہوا کہ واہ مولا ایسا بچہ اور بیوی ہر کسی کے نصیب میں ہو کہ جو اس خیال سے late night جاگتے ہیں کہ گھر کے سربراہ کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ مگر مجھے اس وقت منہ کی کھانا پڑی جب میں از راہ صلح دال مسور کے کھانے کی فرمائش کر ڈالی جو میں گھر سے نکلتے ہوئے فرمائش کر کے گیا تھا۔ جب بیوی اور بچہ ہم آواز اور یک زبان بولے کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ یقین مانیں منہ اور معدہ دونوں دالم ودال ہو گئے۔ اور بیوی، بچہ منہ بسورتے ہوئے اس خیال سے کہ مجھے بھوک نے ستایا ہو گا کچن کا دروازہ بند کرتے ہوئے گویا ہوئے کہ اگر مجھ سے یہ حرکت مکرر سرزد ہوئی تو باقاعدہ چمٹا اور توا بجاتے ہوئے کچن کے باہر دھرنا دیا جائے گا اور کسی قسم کی سیاسی اور عائلی مداخلت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یقین مانیں پہلی بار عمران خان کے دھرنے کو بوضوسمیت صلواتیں سنانے کو دل چاہا۔ کہ اس کمبخت کی ماں بہن ایک کر دوں کہ شعوری ولاشعوری طور پر اس نے کیسے ہماری ماؤں بہنوں خصوصاً بیویوں کو یہ شعور دے دیا ہے کہ بغیر دھرنے کے آپ اپنا عائلی وازدواجی حق تسلیم نہیں کروا سکتے۔ مگر ہم بھی عمرانی اور عمرانیات کے پروفیسر ٹھہرے، چمٹا اور ''ساس پین''، جو ساسو ماں نے بڑے پیار سے دیے تھے، ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بآواز بلند مردانہ وجاہت و دبدبہ قائم کرنے کے لئے ہوا میں لہرایا ہی تھا کہ جوب آں غزل ایک زوردار اور دھما کہ خیز آواز بلند ہوئی کہ خبردار اگر چمٹے کو چھوا بھی احتجاج اور دھرنا ایک سو چھبیس دن کی طوالت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ سب رعب و دبدبہ۔۔۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ پھر بھی مصنوعی طیش دکھاتے ہوئے بیڈ روم کی بجائے ٹی وی روم کا رخ اختیار کیا، ٹی وی آن کیا تو ہر چینل ایک ہی نیوز کو بریکنگ نیوز کہہ کہہ کے بریک لگانے کے مزے لے رہا تھا۔ کہ کیا دھرنا موجودہ حکومت کی کرسی کے چاروں پاؤں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو پائے گا کہ نہیں۔ صاحب سیاسی کرسی ہلے نہ ہلے ثمرات دھرنا سے ''عائلی کرسی'' کے پاؤں تلے سے زمین نکلتی

صاف دکھائی دینے لگی۔ عافیت اس میں جانی کہ انگریزی کس دن کام آئیگی ،سوری بولو اور ساری رات چین کی بانسری بجاتے ہوئے خوب مزے کی نیند پوری کرو۔

دھرنا دھیرے دھیرے ایسا قومی کھیل بنتا جارہا ہے جس کی زد میں ''میاں'' سے ''مولوی'' اور بیوی سے بیوہ تک ہر کوئی آتا دکھائی دیتا ہے۔ کہتے ہیں کسی بھی مثالی معاشرہ کی پہچان چار پیشے سے ہوتی ہے یعنی استاد، مولوی، جج اور ڈاکٹر، جو آپ کو اچھے اداروں، مدرسوں، عدالتوں اور ہسپتالوں میں میسر ہوں گے۔ دورِ حاضر میں یہ چاروں پیشے پیسوں کی کمی کا رونا روتے ہوئے دھرنوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ استاد اسکول اسمبلی کی بجائے اسمبلی ہال کے باہر، مولوی مدرسے کی بجائے پارلیمنٹ کے سامنے، جج اور وکیل عدالتوں میں بیٹھنے کی بجائے سپریم کورٹ کے احاطہ میں دھرنا مارے نظر آئیں گے، ڈاکٹرز ہسپتال میں دستیاب ہونے کی بجائے مال روڈ پر احتجاج و دھرنا کی مشق کرتے پائے جاتے ہیں۔ جن پر حکومت بھی اکثر و بیشتر اپنی فورس کے ذریعے ایسی مشقِ ستم کرتی ہے کہ دھرنے سے ایک ایک کو دھر دھر کر وہ چھترول کرتی ہے کہ کسی اور دھرنے میں کیا اپنے گھر میں بھی تشریف رکھنے کے لائق نہیں رہتے۔ اس لئے کہ پولیس جس بھی دھرنے سے دھرنیوں کو دھرتی ہے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑتی کہ وہ کسی اور کے قابل رہ سکے۔ کیونکہ بلا امتیاز اعضائے نازک ہاتھ میں گریبان اور ''تشریف'' پہ ڈنڈا برسات کی بارش جیسے برساتی ہے، جب تشریف سوجن سے آلو بن جائے تو جناب پولیس تھانہ کے باہر ایسے گراتی ہے جیسے ٹماٹر کا بھاؤ گرتا ہے، ایسے میں مخملی کرسی اور بستر بھی کانٹوں کی سیج ہی دکھائی دیتی ہے۔ دھرنے کے جراثیموں نے گھر سے لے کر پارلیمنٹ تک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ شکر یہ عمران خان میری ''ویہلی'' قوم کو ایک دھارے پر لانے اور ایک جگہ جمع کرنے پر، ورگرنہ پاکستانی قوم تو ''ڈڈوؤں (frog)'' کی وہ پنج سیری ہے جسے تولنا ناممکن ہے۔ کہ بعد المشرقین قوم کو ایک سمت مہیا کرنا اور فراغت پن کو موسیقی و ناچ گانے میں مصروف کرنا آپ ہی کا کام تھا ورگرنہ اس ملک میں

کئی آئے اور کئی گئے۔ عمران کے دھرنے کے دوران اکثر مجھے خیال آتا کہ دھرنا دینا بھی مداریوں والا ہی کام ہے، مداری میں مداری والا، بانسری کی دھن، ایک بکرا اور بندر، جسے ہمیشہ مداری والا سسرال جانے کا پوچھتا ہے اور وہ نفی میں سر ہلاتا ہے، گویا بندر تک کو سسرال نہیں بھاتا تو جناب ''میاں'' للوکس باغ کی مولی ہیں۔ اور آخر میں ''ایک دوائی تحفہ خاص'' بیچ کر چلتا بنتا ہے۔ جبکہ دھرنے میں جدید آلاتِ غنا، گانوں، گانے والیوں، سرخی والیوں کی نمائش اور کشش حسن سے دھرنے کو حسین بنا کر ویہلی قوم کو جمع کیا جاتا ہے۔ اور سیاسی مداری اپنی اپنی پارٹی کی سیاسی دوائی فروخت کر کے دھرنا لپیٹ کر دوسرے مقام کا راہی ہو جاتا ہے۔ دھرنے کے مرکزی اجزائے ترکیبی، ڈی جے والا بابو، اور سرخی والی

حوریں ہوتی ہیں جن کے گردا گرد ''آوارہ منڈھیر'' ایسے گھومتی ہوئی جمع ہونا اپنا قومی فریضہ خیال کرتی ہے، جیسے نظام شمسی میں سورج کے گرد سیارے، جمہوریت میں وزیر اعظم کے ہالہ میں وزرأ کی ایک فوج ظفر موج، مستیاں کرنے کے لئے، بادشاہت میں بادشاہ سے اردگرد اس کے رشتہ دار اور اپسرا کی سی نرس کے گرد بابے ڈاکٹر مرغ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے جمع ہو جاتے ہوں۔

پاکستان میں ابھی تک دھرنوں کی جو اقسام دریافت ہو کر منظر عام پر آئی ہیں، وہ سیاسی، مولویانہ، وکیلانہ، تعلیمانہ اور عاشق کا محبوب کے گھر کے باہر دھرنا ہے۔ ان تمام مذکور میں عاشق کا دھرنا سب سے مختصر مدت کا دھرنا خیال کیا جاتا ہے کہ موصوف عاشق دھرنے کی ابتدا میں ہی دھر لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی محبوب کے بھائیوں اور کزنز کے ہاتھوں وہ درگت بنائی جاتی ہے کہ خدا پناہ۔ ایک عاشق کو میں نے اس بات پہ اعتراض کناں دیکھا کہ میری درگت میں صرف بھائیوں کا استحقاق بنتا تھا یہ سالے کزنز کون ہوتے ہیں میرے زخموں پہ نشتر لگا کر نمک چھڑکنے والے۔ تعلیمانہ دھرنا ذرا لمبے عرصہ تک چلنے والا دھرنا ثابت ہوا ہے۔ اس دھرنے میں بشمول استاد، پروفیسر، کلرک حضرات کو مار مار کر ایسے بھگا دیا جاتا ہے جیسے سکول میں ماسٹر مار مار کر بچوں کو بھگا دیتے ہیں۔ اس قسم کے دھرنے میں پولیس تمام دھرنیوں کی وہ تعلیم و تربیت کرتی ہے کہ اساتذہ کی نہ تعلیم محفوظ رہتی ہے اور نہ ہی تربیت کسی کام کی۔ اور اگر یہ تعلیمانہ دھرنا شہر قائد میں ہو تو دھرنیوں کو نو دو گیارہ کرنے کے لئے واٹر کینن کا بے دریغ استعمال کر کے اساتذہ کی وہ ''دڑکی'' لگوائی جاتی ہے کہ چیتے کی سپیڈ بھی شرمندہ شرمندہ سی دکھائی دیتی ہے۔ مگر مجال ہے حکومت اپنے کسی بھی فعل میں پانی پانی ہو، کراچی میں گھروں میں پانی دستیاب ہو نہ ہو، دھرنیوں کو دوڑانے، بھگانے اور بھگونے کے لئے وافر ذخیرہ کراچی میونسپلٹی کے پاس ضرور ہوتا ہے۔ دھرنوں سے جن دو پیشوں کو دوام حاصل ہوا ہے، وہ وکیلوں اور سیاستدانوں کا دھرنا ہے۔ وکیلوں کے دھرنے میں سب سے زیادہ مار پولیس سے مار پڑتی ہے یا مارِ آستین سے۔ ہر چند دونوں ماروں سے وکلأ کو اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ روؤں دل کو یا پیٹوں جگر کو میں۔ بارود اور مار آستین کے زہر سے وکلأ برادری کی وہ ریس لگتی ہے کہ ہر وکیل اپنے آپ کو سپر نٹر ثابت کرنے کو تلا ہوتا ہے۔ سب سے طویل دھرنا سیاسی دھرنا ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اس طوالت کا انحصار سیاسی عزائم کی بجائے رومانوی ماحول، میوزیکل نائٹ۔ لالیاں۔ سرخیاں، شعلہ جوانیاں، آنکھوں کی روانیاں اور ''میل ملاپ'' ہوتا ہے۔ سیاسی دھرنے میں سیاسی بلوغت کے ساتھ ساتھ جنسی بلوغت اور افزائش آبادی بھی پروان چڑھتی ہے۔ یعنی قبل از دھرنا ''ایک'' دوران دھرنا ''دو'' اور بعد ازاں دھرنا ''دو سے تین'' اور پھر تین گنا۔ ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے گا کہ کمالِ دھرنا بوجوہ ''جمالِ دھرنا'' ہوتا ہے وگرنہ تو بلی بی لنڈوری ہی بھلی۔ میرے اپنے شہر سے ایک ''منہ متھے'' لگتا بچہ گھر سے تنگ آ کر اسلام آباد دھرنے میں اس غرض سے گیا کہ چلو دو وقت کی دال روٹی کی فکر تو ختم ہو جائے گی اور جب گھر والوں کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا تو واپس کا سفر باندھ لوں گا۔ اب وہ ماشأ اللہ سے بفیضِ دھرنا ایک عدد خوبصورت بیوی اور ایک کیوٹ سے بچے کا باپ ہے۔ اور یہ صاحب اس بات کی آجکل تشہیری مہم چلا رہے ہیں کہ اے کنواروں کبھی زندگی میں سکول کی مس کو مس miss کرو نا کرو کوئی دھرنا مس نا کرنا وگرنہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے اور کنوارے ہی مرو گے۔ یقین نہ آئے تو کسی دھرنے کا حصہ بن کر آزما لیجئے۔ کہ آزمائش شرط ہے اور پھر نیکی کے کاموں میں تاخیر کیسی؟

مراد علی شاہدؔ صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر شعبۂ پاکستان اسٹڈیز فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور طنز و مزاح ہے۔ ''قندِ شیریں'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

ضیاء اللہ محسنؔ

ہوئے تم ڈاکٹر جس کے

مشہور مثل ہے کہ گیدڑ کی جب موت آئے تو وہ شہر کو بھاگتا ہے لیکن اُس گاؤں میں جب کسی کو مرنا ہوتا تو وہ ''گاما کلینک'' کا رخ کرتا۔ جہاں ڈاکٹر غلام حسین عرف گاما اپنے تمام تراوزاروں اور ہتھیاروں کے ساتھ کسی مریض کے منتظر پائے جاتے۔ کلینک کیا تھا؟ بوسیدہ سا ایک کمرہ، دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ایک بینچ اور ساتھ بڑا سا میز!

میز کے عین عقب میں ایک خستہ حال بڑی الماری اور ڈسپنسری، جس کے سامنے قائدِ اعظم دور کا ایک پرانا کولر دھرا ہوتا۔ علاوہ ازیں دوائیوں سے اٹھنے والی عجیب سی بُو نے کلینک کو ایک پُر اسراری جگہ بنا دیا تھا۔

فربہ مائل وجود کے حامل گاما صاحب اپنے تئیں تھے تو ڈاکٹر، لیکن شکل وصورت سے کوئی مریض دکھائی دیتے۔ بہت بار ایسا ہوا کہ ان کے کلینک پر دوا لینے جاؤ تو بے چارے اپنی دوا لینے گئے ہوتے۔ اہلِ گاؤں کے بقول ڈاکٹر گاما کا کلینک دراصل قبرستان جانے کا واحد راستہ تھا لیکن پھر بھی کسی ایمرجنسی کے عالم میں اسی کلینک کا رخ کیا جاتا، وجہ یہ کہ موصوف گاؤں کے واحد ''قابل ڈاکٹر'' تھے یا یوں کہہ لیجیے کہ قصبے میں دستیاب وہ ایک ہی گوہرِ نایاب تھا جسے مجبوراً ڈاکٹر ماننا پڑا۔

گاؤں میں کوئی مریض زیادہ بیمار ہوتا تو کلینک میں لانے کے بجائے ''ہوم سروس'' سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ گاما صاحب بھی ہمہ وقت ایسی ذمہ داری نبھانے کو تیار ہوتے۔ کسی ہوم سروس کے لیے انہیں جب ''سندیسہ'' ملتا تو بڑی مستعدی سے اپنی خستہ حال اور پھٹیچر بائیک کو تھپکی دے کر زوردار کک رسید کرتے۔ یوں ایک بھونچال سا پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ بے چاری بائیک ڈاکٹر گاما کا بھاری بھرکم وجود اٹھائے گلی محلوں میں دوڑتی بھاگتی ہوئی گزرتی تو اس کی مخصوص اور منحوس آواز لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

لوگ گھروں سے باہر نکل آتے۔ پرندے سہم جاتے، پرندے سکڑ جاتے محلے کی عورتیں قبل از وقت ہی رونا دھونا شروع کر دیتیں، درزی کفن کی تیاری کرنے لگتا تو گورکن میاں بھی اپنے اوزاروں سے مٹی جھاڑنا شروع کر دیتے۔ اسی لمحے گاؤں کے موذن بابا خورشید بھی متوقع اعلان کے لیے اپنا گلہ صاف کرنے لگتے۔

اور تو اور محلے کے بچوں کا ایک ہجوم ڈاکٹر گاما کی بائیک کے ساتھ ساتھ ان کی منزل تک جاتا، لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس بدقسمت گھر کو دیکھتے جہاں ڈاکٹر گاما کی بائیک جا رکتی۔ یوں رفتہ رفتہ یہ بائیک قصبے میں موت کی علامت تصور کی جانے لگی۔ فیس تو

ڈاکٹر گاما کی محض تیس روپے ہوگی لیکن ہوم سروس کے اضافی دس روپے وصول کیے جاتے تھے۔

''وقوعہ'' پر پہنچنے کے بعد لوگ ڈاکٹر گاما کا منہ تکتے اور کبھی مریض کو دیکھتے۔ اکثر اوقات ڈاکٹر گاما کی آمد کے ساتھ ہی ملک الموت بھی تشریف لے آتے۔ پھر کچھ دیر کلمے کے ورد کے ساتھ جب اناللہ کی صدائیں گونجتیں تو رونے اور کوکنے کی آوازوں میں تیزی آجاتی۔

دور دور سے لوگ تعزیت کے لیے آتے تو ایک ہی سوال کرتے: ''ڈاکٹر گاما نے کون سا ٹیکا آزمایا تھا؟'' بے چارے ڈاکٹر گاما کفِ آستین افسوس سے ملتے گردن ہلاتے واپسی کی راہ پکڑتے۔ انہیں ہمیشہ یہی شکوہ ہوتا کہ ہمیں تب اطلاع دی جاتی ہے جب مریض عین موت کے کنارے ہوتا ہے۔ انہی باتوں کی بدولت لوگ انہیں ڈاکٹر عزرائیل کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ کچھ لوگ تو اب ڈاکٹر گاما سے دوا لینے کو خودکشی میں شمار کرنے لگے تھے۔

گاما کلینک کے عین سامنے قصائی کی دوکان تھی۔ پیشے دونوں کے الگ لیکن کام تقریباً ایک ہی تھا۔ کلینک کے باہر بچوں اور بڑوں کی تمام ظاہری و باطنی بیماریوں کے نام ترتیب سے لکھے گئے تھے۔ ان کے نیچے ہی جلی حروف میں ایک عبارت درج تھی۔

''یہاں موت کے علاوہ تمام بیماریوں کا کامیاب اور شرطیہ علاج کیا جاتا ہے''

اس جملے پر کچھ ناہنجاروں نے انہیں ''ڈاکٹر کلونجی'' کے نام سے پکارنا شروع کردیا۔ ویسے تو ڈاکٹر سرنج بھی انہی کا لقب تھا لیکن ساری بیماریوں کے شافی معالج ہونے کے ناطے زیادہ شہرت ان کے لقب ''ڈاکٹر سارے گاما'' نے پائی۔

مشہور تھا کہ کوئی مریض موت و حیات کی کشمکش میں ہو تو ڈاکٹر گاما کی خدمات حاصل کرنے کے بعد اکثر اوقات وہ اس کشمکش سے ہمیشہ کے لیے ''خلاصی'' پا جاتا۔ شاید اسی لیے ان کا ایک لقب ڈاکٹر موت بھی تھا۔

ڈاکٹری بننے کا پس منظر بتاتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ اسی کی دہائی میں بنگلہ دیش میں ایک ڈاکٹر کے لیے سو مریض تھے۔ جب کہ پاکستان میں ایک ڈاکٹر کے لیے پندرہ سو مریض، چناں چہ بنگالیوں نے ڈاکٹر نام کی اس بڑھتی ہوئی مخلوق پر قابو پانے کے لیے میڈیکل کالج بند کردیے تھے۔ ڈاکٹروں کی بنگال میں اس قدر بہتات تھی کہ لوگ مریض بن کر ڈاکٹروں کی خدمت کرنے کو ترجیح دیتے۔ چوں کہ پاکستان میں معاملہ اس کے برعکس تھا اس لیے بقول ڈاکٹر گاما انہیں یہ کام ''سیکھنا'' پڑا۔ ڈاکٹر گاما سے ایک بار ہم نے سوال کیا کہ سر! یہ گاڑیوں اور موٹروں کا کام تو ہے نہیں کہ جو سیکھا جائے۔ ڈاکٹری تو باقاعدہ پڑھنا پڑتی ہے۔ جواب میں وہ تلملا کر کہتے: ''بھئی کتنی بار کہا میری دکان میں فلسفہ مت جھاڑا کرو۔''

''اوہ ڈاکٹر صاحب! دکان نہیں، یہ تو کلینک ہے!'' ہماری نکتہ چینی پر وہ برا منا گئے۔

''بھئی لگتا ہے تم ہمارے گاہک بھگاؤ گے۔'' اب کی بار قہقہہ روکنا مشکل تھا:

''ہاہاہا۔ ڈاکٹر صاحب! گاہک نہیں، مریض کہیے مریض!'' ہماری اس نوک جھونک پر وہ شدید نالاں ہوئے۔

چونکہ کسی زمانے میں ہمارا تکیہ کلام ''آپ کی دعائیں'' رہا ہے۔ سو راہ چلتے ایک باراں سے سلام دعا ہوئی۔ پوچھنے لگے: ''کیا حال ہے بھئی؟'' ہماری زبان پھسل گئی: ''دوائیں ہیں آپ کی ڈاکٹر صاحب!'' بس اتنی سی بات پر غصہ کر گئے۔

جوشؔ ملیح آبادی نے جگرؔ مراد آبادی کو چھیڑتے ہوئے کہا ''کیا عبرتناک حالت ہے آپ کی۔۔۔ شراب نے آپ کو رند سے مولوی بنا دیا ہے اور آپ اپنے مقام کو بھول گئے۔ مجھے دیکھیے کہ میں ریل کے کھمبے کی طرح اپنے مقام پر آج بھی اٹل کھڑا ہوں، جہاں سے آج سے کئی سال پہلے تھا۔''

جگرؔ صاحب نے برجستہ جواب دیا ''بلاشبہ آپ ریل کے کھمبے ہیں اور میری زندگی ریل گاڑی کی طرح ہے جو آپ جیسے ہر کھمبے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہر مقام سے آگے اپنا مقام بناتی جا رہی ہے۔''

گاؤں میں کوئی ایسا گھرانا نہ تھا جہاں ڈاکٹر گاما کا ''فیض'' نہ پہنچا ہو۔فیض ان کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا جو ادھار خوروں سے رقم لینے یا کسی جگہ دوا پہنچانے کے کام آتا تھا۔

گاما صاحب ہمہ وقت سرجن، ماہر امراضِ جلد، امراض، ماہر امراضِ چشم، ماہر امراضِ قلب اور ماہر امراضِ جگر و معدہ تھے۔ علاوہ ازیں تازہ سبزی، اور موبائل کارڈز بھی ان کے ہاں دستیاب ہوتے۔

ڈاکٹر گاما مساوات کے قائل تھے۔ بیماری کچھ بھی ہو لیکن دو کام وہ ہر مریض کے ساتھ کرتے۔ایک اپنی پٹاری میں موجود رنگ بھرے ٹیکوں میں سے ایک ٹیکہ ضرور لگاتے۔ دوسرا وہ ہر مریض کی تشخیص میں ''گیس کا مسئلہ'' لازمی لکھتے۔ایک اندازے کے مطابق بلوچستان کے ضلع سوئی کے بعد سب سے زیادہ گیس ڈاکٹر گاما ہی کے کلینک سے برآمد ہوتی۔ایک بار تو غضب ہو گیا بے چارے زیدی صاحب کو اللہ صحت دے بزرگ آدمی ہیں۔کسی حادثے میں ان کا سر پھٹ گیا۔''تشخیص'' کے بعد ڈاکٹر گاما نے انہیں بھی گیس کی شکایت بتائی۔

توجہ دلانے پر وہ کچھ گڑ بڑائے: ''بھئی اس میں غلط کیا ہے حادثے کے وقت انہیں گیس کی شکایت نہ ہوئی تو ان کا سر نہ چکراتا سو نہ یہ گرتے اور نا ہی ان کا سر پھٹتا۔'' ڈاکٹر گاما کی ایسی منطق پر بڑے بڑے لوگ چکرا جاتے۔

بسا اوقات وہ زکام جیسی بیماری پر بھی بنڈل بھر گولیاں تھما دیتے۔ویسے اگر دیکھا جائے تو گولیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ڈاکٹر کی گولی، جو جان بچاتی ہے۔ بندوق کی گولی جو جان لیتی ہے لیکن ڈاکٹر گاما کی گولیاں ہمہ گیر صلاحیتوں سے مالا مال تھیں جو بیک وقت دونوں کام بخوبی سرانجام دیتیں۔بس مریض کی قسمت ہی اسے بچانے کے کام آتی۔

جیل آپ کا دیکھا بھالا ٹھکانہ تھا جہاں ہر دو چار ماہ بعد وہ چلہ کاٹنے جایا کرتے۔حسبِ معمول پولیس انہیں حوالات یا جیل کی سلاخوں سے بغل گیر ہونے کا موقع فراہم کرتی رہتی تھی۔

ایک بار ان کے کلینک کسی مریض نے دوا لینے کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے سیرپ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔لمحہ بھر میں زمین پر گر کر وہ تڑپنے لگا۔آخر کار ٹھنڈا پڑ گیا۔یہ دیکھتے ہی ڈاکٹر گاما بجلی کی سی تیزی سے باہر بھاگے۔ بڑی مشکل سے بھینسوں کے باڑے سے انہیں برآمد کر کے حوصلہ دیا گیا کہ وہ سب مذاق تھا۔

ایک بار محلے کے سردار کا کاجی کا بیٹا اپنی بھیڑ کا بچہ لیے کلینک میں آدھمکا ''ڈاکٹر صاحب!اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔جلدی سے پٹی کر دیں۔'' ڈاکٹر گاما نے بغیر کچھ سوچے فوراً ویٹرنری ڈاکٹر کا روپ دھار لیا اور جھٹ سے پٹی کر دی۔

''کتنے پیسے ڈاکٹر؟'' لڑکے نے پوچھا

''صرف چھے سو روپے''

''اوہ! صرف چھ سو؟ آپ یوں کریں کہ تین سو دیں اور یہ (لیلا) بھیڑ کا بچہ ہی رکھ لیں۔'' لڑکے نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر گاما ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی عملی تصویر بن گئے۔

ایک بار کوئی بزرگ آنکھوں سے کم دکھائی دینے کی شکایت لیے کلینک میں حاضر ہوئے۔ڈاکٹر گاما نے بہتر مشورہ دیا کہ بزرگو! بہت دنیا دیکھ لی، اب جانے دیں مگر بابا جی بضد تھے کہ ابھی تھوڑی سی اور دیکھنی ہے۔چارو ناچار ڈاکٹر گاما نے تین چار سفوف ملا کر اچھی طرح انہیں ایک عرق میں گھولا اور یہی سیال مادے کا آمیزہ بزرگ کی آنکھوں میں انڈیل دیا لیجیے پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔شاید یہ اُن کا آخری کیس تھا۔اس کے بعد لوگوں نے ڈاکٹر گاما جیسی نادر شخصیت کو گاؤں بدر کر کے ہی چھوڑا۔

ضیاء اللہ محسنؔ بچوں کے معروف شاعر اور ادیب ہیں اور ایک عدد کتاب کے مصنف بھی۔شگفتگی اور طنز و مزاح ان کا خصوصی میدان ہے۔اُن کی ایک نظم پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتاب میں بھی شامل ہے۔موصوف کی چند نظموں کے ترکی زبان میں تراجم بھی کیے جا چکے ہیں۔''الف نگر میگزین'' کے مدیر ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کے خاص کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

چائے، چرس اور سگریٹ

راشد حمزہ

حجرے میں بہت سارے دوست جمع تھے، محفل مختلف النوع موضوعات پر مباحثوں سے گرم تھی، حاضرین محفل میں نوعمر کھلنڈرے جوان تھے، پختہ عمر بھی تھے تو عمر رسیدہ بوڑھے بھی اپنی موجودگی ثابت کر رہے تھے، ایک دوست میکاؤلی طرز سیاست پر گفت گو فرما رہے تھے، بولے ''میکاولی طرز سیاست میں اخلاقیات اور اصول شئے رفیع نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس طرز سیاست کی اخلاقیات اور بنیادی اصول یہ ہیں کہ جس طریقے سے بھی اپنے مقاصد اور نتائج حاصل کئے جائے جائز ہے، مقاصد کے حصول کی راہ میں جو بھی رکاوٹ پیش آئے، وہ ناجائز ہے۔''

موجودہ سیاسی حالات سے تنگ ایک خوش شکل آدمی نے لقمہ دیا ''لیکن ہمارے سیاست دانوں میں تو میکاؤلی نام کا کوئی سیاست دان موجود نہیں۔''

اِتنے میں ایک کونے سے آواز آئی ''گفت گو غیر دلچسپ ہوتی جارہی ہے موضوع بدل دیجیے۔''

موضوع بحث بدل گیا۔ ایک نوعمر دوست جو نوعمری میں عمر رسیدہ نظر آرہا تھا، نے بڑی بور قسم کی گفتگو شروع کردی، کہا ''دکھ رنج غم اور مایوسی ہمیں لمحے کی پراسرار روح اور عمیق گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے۔''

ان کی گفت گو ان کی فکر اور مطالعے کی گہرائی کا تاثر دے رہی تھی۔ محفل پر مایوس انگیز خاموشی چھاگئی۔ اِتنے میں ایک اور دوست نے کہا ''دوستو! گیئر بدل دیجیے۔۔۔حاضرین محفل جوش سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔''

گفت گو کرنے والے نوعمر دوست نے ان الفاظ کے ساتھ گفتگو دوسرے دوستوں کے حوالے کردی، کہا ''زندگی ایک جشن کا نام ہے، اب جب ہم پیدا ہوگئے ہیں تو کیوں نہ اس جشن میں خوب شامل رہیں، خوب جئیں، ہنسیں اور قہقہے لگائیں۔''

ان کی اس بات پر خوب واہ واہ ہوئی دوستوں نے تالیاں بجائیں اور صاحب گفتگو کی تحسین وتعریف میں زمین واسمان کے قلابے ملا دیئے۔ محفل میں جوش وخروش واپس لوٹ آیا، بوڑھوں کے خزاں رسیدہ چہروں پر حیات کی تازگی نمایاں ہونے لگی۔

ایک بوڑھے دوست اُٹھے، میز پر رکھے سب کپ چائے سے بھر گئے، ماحول پر پودینے کی چائے کی خوشبو سرما کی دھند کی طرح قبضہ کرگئی۔ بوڑھے دوست نے چائے کی افادیت پر تقریر جھاڑنا شروع کردیا۔ حاضرین ہمہ تن گوش ہوگئے، وہ کہہ رہے تھے ''کبھی کبھی مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوجاتی ہے کہ چائے جیسی نشہ اور چیز کسی بھی مذہب میں حرام نہیں ہے، ویسے دوستو اگر حرام

بھی ہوتی تو میں خود کو چائے نوشی سے نہیں روک پاتا، کبھی کبھی مجھے اس پر بھی حیرانی ہوجاتی ہے کہ چائے اگر حرام نہیں ہے تو نشہ آور کیوں ہے۔''

محفل سے ایک ساتھ آوازیں اٹھیں ''چائے پلادیجئے چائے انڈیل دیجئے، یہ کپ اس تازگی بخش اور فرحت بخش مشروب کے نام۔''

چائے نوشی کا دور جاری رہا ہر شخص کے چہرے پر تازگی اور فرحت کی پھریریاں لہرانے لگیں۔ اتنے میں متجسس نگاہوں کے ساتھ فلسفے کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لے آیا، وہ چہرے سے مضمحل اور پریشان لگ رہا تھا، سر پر گنتی کے دس پندرہ بال کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہے تھے۔ کسی نے پوچھا ''پروفیسر صاحب، آج کل کیا مصروفیت ہے۔''

اُس نے جواب دیا ''دوست! آج بری طرح مصروف رہا ہوں، صبح زوجۂ محترمہ کو ان کے مصنوعی دانت نہیں مل رہے تھے، دوپہر تک دونوں تلاش کرتے رہے، جب وہ مل گئے تو اب میری عینک گم ہوگئی ہے، پچھلے تین گھنٹوں سے تلاش جاری ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔''

ایک دوست نے کہا ''پروفیسر صاحب! عینک تو عین آپ کی آنکھوں کے سامنے ناک پر رکھی ہے۔''

پروفیسر نے وہاں ہاتھ مارا تو خود کو ایک غلیظ گالی دے ڈالی اور کہا کہ اب دیکھنے کے لئے عینک کے ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہوگیا ہے کہ عینک میری آنکھوں پر رکھی ہے۔

پروفیسر صاحب محفل میں بیٹھ گئے، ایک کونے میں سرگوشی ہوئی ''پروفیسر صاحب اتنے ویہلے ہوتے ہیں کہ پورا دن کتابوں میں جتھے رہتے ہیں۔''

سرگوشی پروفیسر صاحب نے سن لی، بولے ''بیٹا!! یقیناً میں بہت ویہلا آدمی ہوں، میرے پاس کتاب پڑھنے کے علاوہ کوئی قابل ذکر کام نہیں۔۔۔ یہاں ہر آدمی روزگار دنیا میں بری طرح مصروف ہے، یہاں تک کہ واضح اکثریت تو مصروفیت کی وجہ سے نماز بھی آدھی پڑھتی ہے، بعض تو اتنے زیادہ مصروف رہتے ہیں کہ نماز پڑھنے کے لئے صرف عید کے دن فارغ ہوجاتے ہیں۔''

اپنی قلیل سی دانش وری کے بعد پروفیسر صاحب نے کہا ''اے محفل کے میرے زندہ دوستو! کیوں نہ چرس کا دور شروع کیا جائے؟''

ہر طرف سے متفرق قسم کی آوازیں کمرے کی فضا میں ایک وقدرے کے ساتھ بغلگیر ہوگئیں۔ کسی نے کہا ''کیوں نہیں۔'' کسی نے کہا ''تھوڑی دیر بعد ٹھیک رہے گا'' تو کسی نے کہا ''ہمارے مشاہدے کے مطابق پروفیسر صاحب مشورہ ہمیشہ ٹھیک وقت پر دیتے ہیں''

متفقہ طور پر چرس کا دور شروع ہوگیا، حاضرین محفل ہتھیلیوں میں چرس اور تمبا کو مسلنے لگے، فضا میں لطیف دھویں کے ساتھ چرس کی بو گھل ملنے لگی، چرس کا دور باقاعدہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ سب مخمور ہونے لگے، پروفیسر صاحب نے اپنی دانشوری جھاڑتے ہوئے کہا ''دوستو میری بات یاد رکھو، محفل سے آواز آئی، سر آپ کی باتیں اتنی احمقانہ ہوتی ہیں کہ خود بخود یاد رہ جاتی ہیں، اس پر محفل قہقہوں کے سمندر میں غرق ہوگئی۔''

پروفیسر نے اپنی بات جاری رکھی کہا ''میں خدا سے ڈرتا ہوں کوئی قابل اعتراض حرکت نہیں کرتا، چرس کے بارے میں علماء کہتے ہیں کہ چرس حرام ہے لیکن میں پیتا ہوں گزارہ نہیں ہوتا۔ دراصل بات چرس کو برداشت کرنے کی ہے، عقلمند چرس کے دسوں سگریٹ پینے کے بعد بھی آہستہ آواز میں باتیں کرتے ہیں، پرامن اور سنجیدہ نظر آتے ہیں، جب کہ بے وقوف ایک کش لگانے پر بھی بہک جاتا ہے اور الجھ جاتا ہے۔''

راشد حمزہ کا تعلق قدرتی جنگلات اور شفاف پانیوں کے چشموں، ندیوں اور خوبصورت وادیوں کی سرزمین سوات سے ہے تاہم سکونت لاہور میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ موصوف خطے کے سماجی اور سیاسی حالات و واقعات کے شاہد اور تبصرہ نگار ہیں۔ فیس بک پر خاصے متحرک ہیں۔ ان کے مضامین میں چلبلاہٹ اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ''ارمغان ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

جاوید مرزا

سائبر نظربندی

میرے پاس ایک اسمارٹ فون تھا، جسے میں نے بلائے آرام وسکون اور دن بھر غیبتوں اور لفاظی سازشوں کی جڑ سمجھ کر ایک عرصہ سے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ نیکیوں میں تو کسی بھی سبب اضافہ نہیں ہو رہا، کم ازکم غیبت کے گناہوں میں تو روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کی طرح اضافہ نہیں ہوگا۔

وطن واپسی پر فوری طور پر ایک فون کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسی مذکورہ فون کو زیرِ استعمال لانا چاہا لیکن موبائل ہم سے یوں گریزاں تھا جیسے ''چائے پانی'' نہ ملنے پر کلرک بابو یا علاقائی ترقیاتی منصوبہ میں کمیشن نہ ملنے پر سیاست دان۔

کسی خیر خواہ (یقیناً نیتِ بدخواہی سے) نے مشورہ دیا کہ کسی بھی موبائل کی دکان سے اس علالتِ گونگاازم کا علاج با آسانی اور ارزاں ہوسکتا ہے۔

ہم نے بھی اپنی ضرورت کی شدت کو مدِ نظر رکھ کر ایک معصوم بھولے بھالے نوجوان موبائل ایکسپرٹ کے حوالے کیا اور شام تک اسے حیاتِ نو دینے کا وعدہ بھی لے لیا۔ حسبِ وعدہ شام کو ہم دکان پر گئے تو ایکسپرٹ صاحب نے موبائل مذکورہ کی اتنی پیچیدگیاں بیان کیں، جو کالا باغ ڈیم بنانے کی راہ میں بھی حائل نہ ہوں گی۔

ہم نے درباری خوشامد کا سہارا لے کر اُن کے ہنر اور کمال کی تعریف کرتے ہوئے گزارش کی ''آپ کی مہارت اور تجربے کے سامنے یہ مسائلِ موبائل تو کچھ بھی نہیں، آپ پوشیدہ امراضِ موبائل کے حکیم لقمان ہیں اور موبائل کی صورت دیکھ کر ہی مرض کی نوعیت اور کسٹمر کی مالی حیثیت بھانپ جاتے ہیں۔ آپ کے پُرشباب در پر ایک سوالی بزرگ آیا ہے۔۔۔ اِسے خالی ہاتھ مت جانے دیں آپ کی کمائی کے اہداف میں اضافہ ہوگا۔''

میری التماس سُن کر اس معصوم چہرے نے شاطرانہ تبسم فرمایا اور کہا ''انکل جی، اِس مشکل ترین مرمت پر میرا معاوضہ حقیر سا ہی ہوگا۔''

ہم نے معاوضے کی رقم عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کی لیکن جواب سُن کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ حلق کا کوا تک کائیں کائیں کرنا بھول گیا۔ جسم پسینے سے شرابور اور ماتھے سے ندامت اور خجالت کا شاور برسنے لگا کہ ہم پر ابتلا اور آزمائش

کی یہ گھڑی خود پر ہمارے ہی اور جینیس (زائد از ضرورت خود اعتمادی geniusOver) ہونے کے کارن آن پڑی ہے۔

خیر ہم نے بزرگانہ تجربے کی آڑ لیتے ہوئے مرمت (بشمول اپنی مالی بھی) کی حامی بھر کر بظاہر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے وعدہ لے لیا کہ چند روز بعد آ کر لے جائیں گے۔

وہ چند روز آئے بھی اور چلے بھی گئے مگر ہم انتقاماً (یہ سوچ کر کہ اتنی رقم سے تو ہم نیا موبائل خرید سکتے ہیں) اُس دکان پر نہیں گئے، جہاں ہمارا سابقہ موبائل تندرست ہو کر انتظار بہ کاؤنٹر تھا۔

ایک روز ہم حسبِ معمول فیس بک گروپس پر اپنی پوسٹ یکے بعد دیگرے آویزاں کر رہے تھے کہ یکلخت "اہلِ فیس بک" کی جانب سے انتباہ یعنی وارننگ کے بجائے سزا کا حکم نمودار ہوا کہ ہمارے اصُول وضوابط کی خلاف ورزی پر آج سے فلاں فلاں تاریخ تک آپ کوئی بھی پوسٹ نہیں کر سکتے۔ (ماسوائے لائیکس اور کمینٹس)

ہائے ہائے۔۔۔ ہمیں کسی بھی تعلیمی امتحان، امتحان کیوپڈ اور صبر کے امتحان میں ناکامی پر اِتنا صدمہ نہیں پہنچا جتنا اس فیس بکی سزائے بے گناہی پر۔ سوچ سوچ کر دماغ شل ہو گیا کہ" یہ کیا ہوا، کیسے ہوا، کب ہوا، کیوں ہوا؟"

اعصاب شکنی اور ذہنی شکست و ریخت کے عالم میں اپنی خاتونِ اوّل تا آخر سے بنا آنسو رونی صُورت بنا کر پورا ماجرا بیان کیا، تو بجائے میری دلجوئی کرنے کے، اُنھوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، جس کی آواز سُن کر پڑوسیوں کے کان کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اپنی اپنی دیواروں کے کانوں listening devices کی طرف رجوع کیا، اس یقینِ محکم کے ساتھ کہ آج پھر گھر کے مرد سے کوئی قابلِ سرزنش حماقت سرزد ہوئی ہو گی جس کا حظ نہ اُٹھانا کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔

خیر صاحب، پیٹ بھر کر" قہقہہ بازی" کے بعد ہمارے لاڈلے نواسے کی نانی اماں نے فرمایا "اتنی معمولی سی بات آپ کو سمجھ کیوں نہیں آئی کہ اُس موبائل ایکسپرٹ نے آپ کا مریض موبائل درست کر کے انتظار کیا ہو گا اور اس انتظار کے بے سود ہونے کے سبب سود کے ساتھ یوں انتقام لیا ہو گا کہ آپ کے فیس بک اکاونٹ کی مدد سے کہیں نہ کہیں چٹخارے دار سُلگتی سائبر دست درازی کی ہو گی، جس پر کسی شکائیت کنندی/کنندہ پر آپ اس سزا برحق کے مستحق ٹھہرے، آخر اکاونٹ تو آپکے نام کا ہی ہے نا۔۔۔ یہ کھلا راز تو گھٹنوں چلتا بچہ بھی جانتا ہے اور آپ تو میرے نقش قدم پر بھاگتے ہیں۔"

ازدواجی نقاد کی حقیقت پسندی اور صاف گوئی نے میری جھنجھلاہٹ، تلملاہٹ اور گھبراہٹ کو ایکسل صرف کی جھاگ کی مانند دھو کر رکھ دیا اور میں گھٹنوں چلتے بچے جتنا ہو کر اس قابل ہو گیا کہ اس راز کی ماہیت کو سمجھ سکوں۔ انجانے ہاتھوں میں موبائل دینے کی حماقت مزید شفاف اور نکھر گئی۔

مگر اب کیا ہوت جب سیلفیاں چگ گیں" میرے اکاونٹ کا کھیت۔"

خیر صاحب ؎

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
بندہ چھوٹا خدا خدا کر کے

مساں مساں (خدا خدا کر کے) سزائے خطا ہی پوری ہونے پر ہم اس تحریر کو پوسٹ کر کے "جشنِ آزادیِ اکاونٹِ ذاتی" منا رہے ہیں۔ مشتری ہوشیار رہیں اور گواہ رہیں تا کہ بوقتِ ضرورت کام آسکیں۔

جاوید مرزا صاحب کا تعلق شاہینوں کے شہر سرگودھا سے ہے لیکن ان کے پیروں میں جو چکر ہے وہ اِنہیں کہیں ٹھہرنے نہیں دیتا۔ ادب سے شغف رکھتے ہیں اور فکاہیہ ادب سے اِنہیں خصوصی رغبت ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے حافظ ہیں۔ فیس بک پر ان کے مزاحیے اکثر طلوع ہوتے رہتے ہیں۔ یوسفی صاحب کے اثرات ان کے اندازِ تحریر میں خاصے واضح ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کے لئے یہ اِن کی اوّلین تحریر ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

حنیف عابد

غُل غپاڑا

زندگی اپنے ڈھب پر آگے تو بڑھتی رہتی ہے لیکن اپنے پہلو میں جو تبدیلیاں لاتی ہے وہ وقت کے ساتھ ایک نئے انداز سے ہمارے سامنے آکر اپنا الگ وجود منوانے لگتی ہیں۔ بات سماجی، ثقافتی، سیاسی، معاشی، لسانی اور اجتماعی رویوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ زبان کے استعمال تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ کئی محاورے اپنی اصل معنیٰ کے بجائے نئے معنیٰ کے ساتھ زیادہ سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ ویسے بھی یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ زندہ زبانوں میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔ نت نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے ہیں جبکہ کچھ الفاظ کا استعمال متروک ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ یا محاورے اپنی سابقہ مطالب اور مفاہیم سے ہٹ کر بھی بولے جاتے ہیں۔

ہمارے محلے میں رہنے والی خالہ نصیبن اس حوالے سے بہت ہی زیادہ شاکی ہیں۔ وہ زبان کی بگڑتی ہوئی کیفیت پر اتنی چراغ پا نہیں ہوتی ہیں جتنی وہ اپنے ناپسندیدہ معاملات پر ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے اگر غلطی سے بھی کسی ایسی بات کا ذکر آجائے تو وہ اس کا سارا نزلہ زبان اور اس کی ٹوٹ پھوٹ پر نکال دیتی ہیں۔ وہ جب بھی ہمارے گھر تشریف لاتی ہیں تو والدہ ماجدہ سے ان کے تاریخی تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر گفت وشنید کے دوران (گفت کا زیادہ تر فریضہ خالہ نصیبن ہی انجام دیتی ہیں) خالہ ادبدا کر کوئی ایسا موضوع ضرور چھیڑ دیتی ہیں جس کی تان زبان کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر ٹوٹتی ہو۔

ایک دن تو غضب ہی ہو گیا دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں خالہ نصیبن کاٹن کا ٹوپی دار برقع (جس کا گھیر بلاشبہ کسی بڑی پیراشوٹ سے کم نہیں تھا) سر پر جمائے اور اس کا گھیر کمر کے گرد نصف دائرے کی شکل میں لپیٹے بائیں ہاتھ سے تھامے آدھمکیں۔ اتفاق سے امی جان پڑوس میں کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ خالہ نصیبن کو جب یہ معلوم ہوا تو خلاف معمول انہوں نے واپسی اختیار کرنے کے بجائے میری چھوٹی بہن کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم جڑتے ہوئے اپنا برقع اتارا اور تخت کے کنارے پر رکھے ہوئے موںڈھے پر لپیٹ کر رکھتے ہوئے مجھے ہدایت دی "جا رے! ذرا لپک کے اپنی ماں کو بلا لا، اور دیکھیو! انہیں کہہ دینا کہ ترنت آجائیں بہت ضروری بات ہے۔"

خالہ نصیبن کا حکم سنتے ہی میں تو امی حضور کو بلانے چل دیا اسی دوران چھوٹی بہن ٹھنڈے پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے صحن میں نمودار ہوئی۔

امی حضور جیسے ہی گھر پہنچیں تو انہوں نے دیکھا کہ خالہ تخت پر

گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے پاندان کھولے ہوئے چھالیہ کتر رہی ہیں۔ انہیں مطمئن دیکھ کرامی نے میری جانب دیکھا! جیسے پوچھ رہی ہوں ’’یہاں تو سب خیر کے آثار ہیں، تم نے تو کچھ اور ہی کہانی سنائی تھی؟‘‘

امی کے استفہامیہ انداز پر میں نے کندھے اچکاتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ طوفان ٹل چکا ہے۔

خیر! امی کو دیکھتے ہی خالہ نصیبن گویا ہوئیں ’’ارے بھئی اس آگ برساتی گرمی میں کہاں گھومتی پھر رہی ہو؟‘‘

امی نے قدرے حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور کہا ’’بس ذرا دیر کے لئے پڑوس میں گئی تھی، کل ان کے گھر کچھ مہمان آنے والے ہیں تو انہوں نے مشورے کے لئے بلایا تھا، آپ سنائیں؟ خیریت تو ہے جو اس سخت گرمی میں نکل آئیں۔‘‘

خالہ نے امی کے جوابی وار کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ’’میں کہاں آتی تھی؟ بس میری بہو نے بات ہی ایسی کردی کہ جی گھر میں نہیں لگ رہا تھا سوچا تم سے دو باتیں کر کے جی ہلکا کرلوں لیکن تمہیں تو لوگوں کے مسائل حل کرنے سے ہی فرصت نہیں۔‘‘

یہ سن کر امی نے کہا ’’کیا کہہ دیا بہو نے جو اتنی چراغ پا ہو رہی ہو؟‘‘

خالہ بولیں ’’اے لو، وہ نگوڑ ماری مجھے کیا بولے گی میں تو اس کی بقراطیت سے تنگ آچکی ہوں، جب دیکھو اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہے۔‘‘

کچھ دیر بہو کی برائی کرنے کے بعد خالہ نصیبن نے اصل واقعہ سے پردہ اٹھا ہی دیا۔ کہنے لگیں ’’ہم اپنے بچپن سے سنتے اور بولتے آئے ہیں کہ غل غپاڑہ مچانا بچوں کا کام ہے۔ اس محاورے کا مطلب شور وغوغا کرنا، ہنگامہ کرنا، فریاد کرنا یا اسی قسم کے دیگر معنیٰ میں یہ محاورہ استعمال ہوتا آیا ہے۔

امی نے جواب دیا ’’بات تو ٹھیک ہے، پر اب کیا ہوگیا؟‘‘

خالہ بولیں ’’لو ہونا کیا ہے، ہماری بہو بیگم کہتی ہیں کہ ٹی وی پر

جو ٹاک شوز ہوتے ہیں ان میں سوائے غل غپاڑے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔"

خالہ کی بات سن کر امی مسکرائیں لیکن میں اپنی ہنسی برداشت نہیں کر سکا۔ مجھے کھلکھلا کر ہنستا دیکھ کر خالہ تذبذب میں مبتلا نظر آئیں وہ یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ میں ان کی بات پر ہنس رہا ہوں یا ان کی بہو کی حماقت پر۔

خالہ نصیبن کی بات اپنی جگہ مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ فکر انگیز بھی تھی۔ اگر ہم غور کریں تو آج کل ہمارے ٹیلی ویژن پر جو کچھ دکھایا جا رہا ہے وہ کسی غل غپاڑے سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔ شام ہوتے ہیں نیوز چینلز پر تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آٹھ بجتے ہی دنگل شروع ہو جائے گا۔ زیادہ تر ٹی وی چینلز پر موضوع یکساں ہوتا ہے۔ ایک آدھ ٹی وی ایسا ہوتا ہے جس کا موضوع عمومی نہ ہو لیکن کہتے ہیں کہ اس کی ریٹنگ دیگر کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ٹی وی چینلز پر ہونے والی لفظی جنگ بغیر کسی منطقی انجام اور بغیر کسی نتیجے کے ہر روز ختم ہو جاتی ہے۔ اگلے دن پھر ایک نئے موضوع کے ساتھ ایک نئی جنگ کا آغاز کیا جاتا ہے۔ گذشتہ روز ادھوری رہ جانے والی بات کسی کو یاد تک نہیں رہتی۔ ایک نئی بحث، ایک نیا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا عوام بے چارے باہمی لفظی گولہ باری کا جائزہ لیتے کہ کس نے نشانے پر چوٹ لگائی ہے اور کس کا وار خالی گیا۔ کچھ لوگ تو اس نوک جھونک کو اتنی توجہ اور انہماک سے دیکھتے ہیں کہ جیسے وہ خود گفتگو میں شریک ہیں۔ بس یہی نفسیاتی حربہ ان کے دل اور ذہن میں پلنے والی محرومی اور نفرت کو بڑی حد تک کم بھی کر دیتا ہے۔ وہ اگلے دن نئی ہمت اور نئی امید کے ساتھ پھر وقت کی چکی کے پاٹ میں پسنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

امی جان نے خالہ کی بات کو سن کر قدرے متاسفانہ انداز میں کہا "بہن یہ جو ٹی وی پر ٹاک شوز ہوتے ہیں انہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو سوائے بلڈ پریشر بڑھانے کے مجھے تو ان کا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔"

خالہ نے کہا "لیکن بہن یہ تو بتاؤ کہ کیا ہم انہیں غل غپاڑہ کہہ سکتے ہیں؟"

"ارے اگر یہ غل غپاڑہ ہے تو ہمارے بچے جو کرتے ہیں وہ کیا ہے؟ میں تو یہ جانوں کہ غل غپاڑہ تو معصوم روحوں کی شرارتوں بھری حرکتیں ہوتی ہیں جو دل کو سکون اور راحت بھی بخشتی ہیں، یہ موئے سانڈ ٹی وی پر بیٹھ کر جو ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھار کرتے ہیں، ایک دوسرے کے گڑے مردے اُکھاڑتے ہیں، یہ تو ایک دوسرے کی میت میں بھی نہیں جاتے ہوں گے، بھلا ان کی لڑائی کو گل غپاڑی کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

خالہ کی بات سن کر میں بیچ میں بول پڑا "خالہ جیسا آپ سمجھتی ہیں ایسا کچھ نہیں یہ، یہ لوگ دکھاوے کے لئے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں پروگرام ختم ہوتے ہی ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور کبھی کبھی ساتھ ہی روانہ بھی ہوتے ہیں۔"

میری بات سن کر خالہ کی تو آنکھیں پھیل گئیں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کومے میں چلی گئی ہوں۔ امی نے میری جانب غصے سے دیکھتے ہوئے جھک کر جیسے ہی چپل اُٹھائی میں صحن سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

حنیف عابد شاعر، ادیب، نقاد، کالم نگار، مضمون نگار، فکشن نگار، ناول نگار، بچوں کے ادیب اور سینئر صحافی ہیں. آپ کا تعلق کراچی سے ہے. ۳۰ سال سے زائد عرصے سے صحافت سے وابستہ ہیں۔ موصوف اپنی غیر جانبدار اور دوٹوک رائے رکھنے کے حوالے سے بدنام ہیں۔ بہترین تجزیہ کار ہیں، ان کی رائے کو رد کرنا عمومی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ ملکی اور عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں. پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں. موصوف کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک شاعری کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ مزید کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں. ایک سال سے زائد عرصے سے ارمغانِ ابتسام میں تسلسل کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔

زبانِ یارِ من اُردو؟

مجیب ظفر انوار حمیدی

میں نے اپنے اُردو کے لیکچرار دوست کو فون کر کے آفس بلایا اور پرجوش آواز میں کہا' اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟''

وہ غصے سے مجھے گھورنے لگا' میں نے طنزیہ لہجے میں سوال دوبارہ دہرایا' وہ غرایا'' کیا یہی مذاق کرنے کے لیے بلایا ہے؟''

میں نے قہقہہ لگایا ''نہیں جانی! بس آج تمہاری اردو کا امتحان لینا ہے' بولو کتنے کی شرط لگاتے ہو؟''

اُس نے دانت پیسے''شرط لگانا حرام ہے۔''

اب کی بار میں نے اسے گھورا'' اگر میں ثابت کردوں کہ شرط حرام نہیں تو؟''

اُس کی آنکھیں پھیل گئیں

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' کرو ثابت۔۔۔!''

میں نے اطمینان سے کہا'' کیا نماز کے لیے وضو شرط نہیں' کیا شادی کے لیے نکاح شرط نہیں؟''

میری دلیل سنتے ہی اُس نے پہلے اپنے بال نوچے پھر میز پر پڑا پیپر ویٹ اٹھا کر میرے سر پر دے مارا لیکن میں چوکنا تھا لہٰذا اس کا نشانہ خطا گیا۔

''چلو اگر تمہیں شرط منظور نہیں تو شرط کا نام انعام رکھ لیتے ہیں۔''

کچھ بحث و تمحیص کے بعد یہ تجویز اُس کو پسند آ گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ میری جیب میں اب رقم آنے والی ہے۔ طے پایا کہ اگر اس نے اُردو بوجھ لی تو میں اُسے ہزار روپے دوں گا اور اگر وہ ناکام رہا تو اُسے ہزار روپے دینا ہوں گے۔ اُس کو یقین تھا کہ وہ یہ مقابلہ ہار ہی نہیں سکتا کیونکہ اُردو سے اس کا بڑا پرانا تعلق ہے اور وہ اس زبان کا ماہر ہے۔

میں نے سر ہلایا اور پوچھا ''کھاتہ ترجیحات'' کسے کہتے ہیں؟''

اُس کا رنگ اُڑ گیا'' کیا کہا؟ پھر سے کہنا!''

میں نے اطمینان سے دوبارہ کہا'' کھاتہ ترجیحات!!''

وہ سر کھجانے لگا۔ میں مزے سے سیٹی بجا رہا تھا۔ اُس کی طرف سے جواب میں تاخیر ہوئی تو میں نے اطمینان سے کہا'' بیٹا اس کا مطلب ہے Account Settings۔ چلو اب یہ بتاؤ'' رازداری رسائی'' کسے کہتے ہیں؟''

وہ مزید ہڑبڑا گیا ''یہ کون سی زبان بول رہے ہو؟''

میں مسکرایا'' بیٹا یہ اُردو ہے' خالص اُردو' اس کا مطلب بھی سن لو' اس کا ترجمہ ہے Privacy settings اب بتاؤ کہ'' ربط کا اشتراک' کیا ہوتا ہے؟''

اُس کے پسینے چھوٹ گئے' ہکلا کر بولا'' نہیں پتا۔۔۔''

میں نے میز بجایا'' میرے پیارے اس کا مطلب ہوتا ہے Share link۔''

وہ بے بسی سے اپنی ہتھیلیاں مسلنے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ایک کش لگایا اور آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا'' فیس بک استعمال کرنا جانتے ہو؟''

وہ اچھل پڑا ''کیا مطلب؟ تم جانتے تو ہو کہ میں چار سال سے فیس بک استعمال کر رہا ہوں۔''

میں نے دھواں اس کے منہ پر پھینکا ''اچھا تو پھر یہ بتاؤ آخری دفعہ تم نے 'تجدیدِ کیفیت' کب کیا تھا؟''

اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور دھاڑ کر بولا ''میں کوئی تمہاری طرح بے غیرت نہیں، میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا!''

میں نے حیرت سے پوچھا ''کون سا کام؟''

وہ گرجا ''یہی جو تم پوچھ رہے ہو!''

میں نے قہقہہ لگایا ''ابے یہ Status Update کی اُردو ہوتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے کتنے 'پیروکار' ہیں؟''

یہ سنتے ہی اُس نے مجھے گردن سے دبوچ لیا ''کیا بکواس کر رہے ہو میں کوئی پیر بابا ہوں، میرے کہاں سے پیروکار آ گئے؟''

میری چیخ نکل گئی، میں نے بمشکل اپنی گردن چھڑائی اور دو قدم دور ہٹ کر چلایا ''کمینے! پیروکار سے مراد 'Followers' ہوتے ہیں۔ ایک موقع اور دیتا ہوں، بتاؤ جب تم فیس بک پر کوئی تصویر لگاتے ہو تو اسے کسی سے ''منسلک'' کرتے ہو؟ کبھی تمہیں ''معاونت تختہ'' کی ضرورت پیش آئی؟ تم 'مجوزہ صفحات' کھولتے ہو؟ تم نے کبھی اپنی ''معلومات کی تجدید'' کی؟ کبھی ''اپنے 'واقعات زندگی' کو 'عوامی' کر کے' پھیلایا؟''

اُس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہی دیر میں وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے گا۔ اُس نے میرے سوالوں کے جواب دینے کی بجائے اپنے ناخن چبانے شروع کر دیے۔ میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا ''تم ہار گئے ہو۔ نکالو ایک ہزار''۔

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا ''نہیں۔۔۔ پہلے ثابت کرو کہ یہ اُردو کہیں استعمال بھی ہوتی ہے!''

مجھے پتا تھا کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گا لہٰذا اطمینان سے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھول کر فیصل کے سامنے کر دیا جہاں Tag کی اردو ''منسلک'' لکھی تھی۔ Support Dashboard کو ''معاونت تختہ'' لکھا ہوا تھا' Recommended Pages کا ترجمہ ''مجوزہ صفحات'' کیا گیا تھا' Life events سے مراد 'واقعاتِ زندگی' تھے اور Everyone کی اردو ''عوامی'' کی شکل میں دستیاب تھی۔

وہ کچھ دیر ہونقوں کی طرح میری ''اُردو مارکہ فیس بک'' دیکھتا رہا' پھر خاموشی سے پرس نکالا' پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر میری ٹیبل پر رکھے' اپنے آپ کو ایک عجیب وغریب سائنسی قسم کی گالی دی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ اب تک اردو ہماری قومی زبان تو نہ بن سکی لیکن فیس بک کی زبان ضرور بن گئی ہے تاہم فیس بک والے ''واجب القتل'' قرار دے دینے چاہئیں جنہوں نے ابھی تک بے شمار الفاظ کا اردو ترجمہ نہیں کیا' مثلاً ٹائم لائن' ای میل' پاس ورڈ' سرچ انجن' پروفائل' فیس بک' کوکیز' ایپلی کیشنز' موبائل' لاگ اِن اور لاگ آؤٹ جیسے بدیسی الفاظ تا حال یہاں موجود ہیں حالانکہ ان کا ترجمہ انتہائی آسان ہے' میری رائے میں 'Facebook' کو ''متشکل کتاب'۔ Timeline کو 'وقت کی لکیر'۔ Email کو 'برقی چٹھی'۔ Password کو 'لفظی گذرگاہ'۔ Cookies کو 'چھان بورا'۔ Application کو ''عرضی'۔ Mobile کو 'گشتی''۔ Search Engine کو ''مشینی تلاشی'۔ Video کو ''متحرک تصاویر'۔ Profile کو ''شخصی ڈھانچہ'۔ Log out کو ''خروج'' اور Login کو ''دخول'' کر دینا چاہیے۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ اب تک انہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔ خصوصاً قلمی خاکے لکھنے میں تو اِن کا جواب ہی نہیں۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر سی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

کائنات بشیر

کاظمی جی کی سحری

رات ابھی گہری تھی۔ پونے تین کے آس پاس کا وقت تھا۔ کاظمی صاحب کی بیوی نے ٹائم پیس آنکھوں کے بالکل قریب کر رکھا تھا جو لوڈ شیڈنگ میں بڑا کام دے رہا تھا، اسے پچھلے سال کاظمی جی گاؤں میں اپنے آبائی گھر سے اٹھا لائے تھے جس کے ہندسے اندھیرے میں بلی کی سبز آنکھوں کی طرح چمکتے تھے سو وہ مندھی آنکھوں سے اَدھ کھلی پلکیں جھپک جھپک کر ٹائم دیکھنے کی کوشش میں تھیں۔۔۔ وقت دیکھنے، اس کا تعین کرنے کے بعد بیوی نے ساتھ والے بیڈ پہ سوئے ہوئے شوہر کو ہلایا ''سنیے میں کیا جی، اٹھ جایئے۔۔ رمضان آ گیا۔۔ روزے پھر شروع۔۔! اور سحری کا وقت ہو گیا ہے۔''

''اچھا۔۔ کس کی سحری کا۔۔؟'' کاظمی نے کچی پکی نیند میں جواب دیا۔

''لو۔۔۔ آپ کی سحری کا۔۔ اب کیا محلے بھر کو سحری کراؤ گے؟'' بیوی بیزاری سے بولی۔

''اچھا۔۔۔ کیا چین میں چاند نکل آیا؟'' کاظمی جی بولے (جو اکثر چین کے دورے پر رہتے ہیں)۔

''نہ میں کیا جی، لگتا ہے آپ کو ہر وقت سفنے چین کے ہی آتے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ آپ دورے پر نہیں ہو۔۔ دھن بھاگ ہمارے، جو آپ پاکستان میں ٹکے ہوئے ہو۔ اور ہاں، یہ میں آپ کو ابھی سے کہے دیتی ہوں کہ میں آپ کو عید چینیوں کے ساتھ نہیں کرنے دوں گی اور چاند کا کیا ہے وہ تو دنیا میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر نکلتا رہتا ہے۔ ملائیشیا، آسٹریلیا، چین کے بعد اب پاکستان میں بھی نکل آیا ہے۔ ویسے اس بار تو خیبر پختونخواہ والوں کو بھی چاند پہلے ڈھونڈنے سے نہیں ملا۔۔۔''
بیوی کے من میں پھلجڑی چھوٹی۔

''اُمِ علیم، کیا میں واقعی پاکستان میں ہوں۔۔۔ اچھا کیا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ میں ابھی سفنے میں چینی، چکن ہاٹ اینڈ سار سوپ پی رہا تھا۔۔ کچھ دیر بعد ناشتہ کرنے والا تھا۔ آج زور انڈوں پہ ہونا تھا۔ میرے اردگرد چینی ہی چینی بیٹھے تھے۔۔۔ اور ہاں وہ اپنا کیا بھلا سا نام تھا اس کا بڑا ہی باشیبا سا بندہ، جس نے لیپ ٹاپ تحفے میں دیا تھا، ہاں گاؤ جون۔۔۔ وہ تو میرے ساتھ ہی میز پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سوپ کے پیالے میں یخنی کے اوپر کیکڑے تیر رہے تھے۔ ویسے مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں پاکستان میں ہوں۔''
اس پر بیوی نے زور سے کاظمی کے بازو پہ چٹکی کاٹی اور بولی ''اب آیا یقین۔۔۔؟''

''او بھاگ بھریئے، یہ کیا۔۔۔ کیا؟ رات بھر مچھر کاٹتے

اصغر اعظم

ایک بار انہوں نے تقریری میں اپنی زندگی کی کہانی ان لفظوں میں سمیٹی میں وطن کا سپاہی تھا، وطن کا سپاہی ہوں، اور وطن کا سپاہی ہی رہوں گا، تو پیچھے سے آواز آئی، ترقی نہ کرنا، اس کے باوجود وہ جس امیدوار کو چاہیں الیکشن میں جتوا سکتے ہیں، انہیں بس اتنا ہی کرنا پڑتا ہے، اس امیدوار کے خلاف کھڑے ہونے پڑتا ہے، ویسے ایک تجزیہ نگار کے خیال میں وہ خود بھی الیکشن جیت سکتے ہیں، بس انہیں اتنا کرنا ہے کہ وہ اس حلقے سے الیکشن لڑیں جہاں سے اصغر خان الیکشن لڑ رہا ہو۔

گل دستہ از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

رہے اور خور پیر کے تڑکے تم۔۔ یا اللہ، میں کدھر جاؤں۔۔۔ اس سے تو اچھا میرا چین کا ہنگامی دورہ کروا دے۔۔۔'' کاظمی نے بازو سہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، خوب سمجھتی ہوں تمھیں۔۔۔ اور تمہارے ناٹکوں کو۔۔۔'' بیوی بولی۔

''اچھا، حاضر جناب!'' کاظمی نے مسکراتے ہوئے کہا ''ویسے ناشتے، مطلب سحری میں کیا ملے گا کھانے کو۔۔۔؟''

''لو، تمھیں سحری میں بھی رمضان کے پکوان چاہییں۔ یہاں ایک نُرتی بھی کھانے کو جی نہیں مان رہا۔'' بیوی بڑبڑائی۔

''لے۔۔۔ یہ بھی کوئی بات ہے، سحری کھانا تو سنت ہے اور دن بھر کی ضرورت ہے۔۔ ویسے بھی بندہ بشر ہوں۔۔ پیٹ ساتھ لگا ہے۔ اور اتنا لمبا اتنا سخت روزہ، توبہ میری توبہ، اللہ اللہ کر کے پار ہوتا ہے۔۔ بھوک سے ہول پڑتے ہیں، پیاس سے تراہ نکل جاتا ہے۔۔ زبان پہ کانٹے اُگ آتے ہیں اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔'' کاظمی جی نے روزے کا نقشہ کھینچا۔

''نہ میں کیا جی۔۔ رمضان میں کھانے پینے پر نہیں نماز روزے پہ دھیان ہونا چاہیئے۔'' بیوی نے علیمت جھاڑی۔

''اُمِ علیم، دھیان کا کیا ہے وہ تو نماز میں بھی اپنے ساتھ نہیں رہتا۔۔ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔'' کاظمی نے بتایا

''ہائے ہائے، میں مرجاواں کون ہے وہ، جس کا دھیان نماز سے بھی زیادہ ضروری ہے۔۔۔ کہیں وہ مَر جانی۔۔۔؟'' بیوی تڑپ اٹھی۔

گنگا اُلٹی بہہ نکلی تھی۔

''استغفر اللہ بیوی۔۔۔ استغفر اللہ، اللہ کا نام لو! رمضان شروع ہو چکا، شیطان کو بھی کَس کے باندھ دیا گیا ہوگا۔۔۔ لیکن تمھارے دماغ پہ ابھی بھی شیطان کا قبضہ لگتا ہے۔ روزہ ابھی شروع نہیں ہوا اور تمھارا دماغ پہلے ہی چوپٹ ہوگیا ہے۔ تم تو مجھ سے بھی گئی گزری ہو۔'' کاظمی نے بیوی کی بات درمیان سے ہی اُچکتے ہوئے غصے سے کہا۔

تھوری دیر خاموشی رہی، پھر بیوی نے ہمت کی۔

''میں کیا سنیے جی، روزے میں صبر کا حکم ہے بات کو ذرا اِدھر اُدھر کر دیں نا۔ ابھی پہلا روزہ ہے اس لیے زبان پھسل گئی۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ پہلے تو لو پھر بولو۔'' کاظمی نے نصیحت کی۔

''ٹھیک ہے آئندہ میں ترازو ہر وقت ساتھ رکھا کروں گی۔'' بیوی نے کہا۔

''اوہو بھئی، عقل کو ہتھ مارو بیوی۔۔۔ میں نے کہاوت بولی تھی۔'' کاظمی نے کہا۔

''اچھا۔۔ میں سمجھی آپ نے سچ بولا تھا۔'' بیوی بولی۔

''توبہ توبہ، اب صبح ہی صبح تمھارے ساتھ کون دماغ کھپائے، اپنی جان مارے۔۔ چلو چھوڑو، مٹی پاؤ بات پہ۔۔ اور ہاں روزہ کون رکھے گا۔۔؟ لختِ جگر علیم کو ضرور اٹھا دینا۔ وہ سارے انعامی کپ رات اپنے ساتھ بستر پر لے کر سویا ہے۔ دیکھنا! کہیں کوئی کپ اس کے نیچے آ کر پچک تو نہیں گیا۔۔۔؟'' کاظمی نے کہا۔

''چلیں کوئی بات نہیں، اگر پچک بھی گیا ہو تو۔۔ اگلے سال وہ پھر کپ لے آئے گا۔'' بیوی نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے کہا ''اور ہاں جی، ابھی سے بتا دوں کہ اس سال عید پہ کافی خرچہ ہونے والا ہے!''

''وہ کیوں۔۔؟ اس بار کوئی انوکھی عید آ رہی ہے۔'' کاظمی نے تیکھے چتون سے پوچھا ''یا حکومت کوئی بونس دینے والی ہے!! بلکہ رمضان پوری طرح شروع ہوا نہیں اور حکومت مہنگائی کے نام پہ پہلے ہی لوٹ چکی ہے۔ جیبوں پر گھر بیٹھے ہی ڈاکہ مار لیا ہے۔۔۔اوپر سے تم خرچے سنا رہی ہو۔''

بیوی اب کی بار ذرا دبی آواز میں بولی ''اب حکومت کی چھوڑیئے نا، یہ کہاں ہم میاں بیوی اور ہمارے گھریلو معاملات کے بیچ آ گئی۔۔۔اب شادی شدہ بیٹیوں والے ہیں تو ناک چاہے سامنے سے پکڑ و یا ہاتھ گھما کر پیچھے سے، یہ تاوان تو بھرنا پڑے گا۔ بیٹیوں کی ان کے سسرال میں عزت بھی بنائے رکھنا ہوگی۔ انھیں اچھی خاصی عید بھیجنا ہوگی۔ اگر بروقت مجھے رقم تھما دو گے تو میں ان کے لیے کپڑے لتے مہندی چوڑا، دیگر لوازمات تیار کر لوں گی۔ اور اگر پچھلے سال کی طرح لارے لگا کر دیتے ہیں تو پھر سیدھا لڑکیوں کے ہاتھ میں جا عیدی تھماؤں گی۔۔۔اب یہ سب آپ پر ہے۔''

''اوہو اُم علیم، یہ تو واقعی بڑا خرچہ ہونے والا ہے!!'' کاظمی صاحب متفکر ہو گئے پھر سوچ کر بولے ''صاحبزادے علیم کو کہہ دینا کہ پچھلے سال والی شیروانی، کپڑے اس عید پر بھی پہن لے۔ لوگوں کو کہاں یاد رہے ہوں گے۔ اور چھوٹی منیا کو کہنا کہ وہ بھی عید پہ پچھلے سال والا ہی لہنگا پہن لے۔ تم عید کے لیے صرف قمیض بنانا۔ اور میں صرف نیا کُرتا بناؤں گا۔ ان کے ساتھ شلواریں ہم دونوں پچھلے سال والی پہن لیں گے۔ تم بھی رمضان میں ذرا ہاتھ روک کر رکھنا۔ خوامخواہ اَللے تللے کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ پکوڑے، پکوڑے تلنے کا کام تکو کی بجائے کسی ماڑے جیھڑے تیل میں کر لینا۔ اور عید کے دن کا مینو ٹائٹ رکھنا۔ کسی کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں۔ عید کی صبح شیر خرمہ۔۔۔ چھوارے، بادام، کھوئے کے بغیر بنا لینا۔ باقی سارا دن ہم کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں، مہمان بن کر گزاریں گے۔ دعوتیں اڑاتے ہوئے بھرپور عید کریں گے۔ یوں بچوں کو لے کر کسی تفریح گاہ بھی نہیں جانا پڑے گا۔ بچوں کو کسی جگہ سے عیدی مل گئی تو یہ اضافی آمدنی ہو گی لیکن تم عیدی دینے کا جھنجھٹ مت پالنا۔ اس طرح جگاڑ کرنے سے کچھ نہ کچھ تو بچت ہو ہی جائے گی۔۔۔''

''لو یہ گھر پہلے ہی میری بچتوں سے چل رہا ہے۔۔۔آپ کا کیا ہے، آپ تو جہاز میں اڑے اڑے رہتے ہو۔'' بیوی بولی۔

''نہ میں کوئی آوارہ پنچھی ہوں جو فضاؤں میں مارا مارا پھرتا ہوں۔۔۔حکومت اپنے خرچے پہ بھیج دیتی ہے تو چلا جاتا ہوں۔'' کاظمی نے کہا

اتنے میں بیوی کی نظر دوبارہ اس آفاقی ٹائم پیس پہ پڑی اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اوئی اللہ، کاظمی جی آپ کی باتوں نے الجھا دیا۔ سحری ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ اب میں روٹی کیسے بناؤں؟''

کاظمی جی ہڑبڑا کر اٹھے اور بولے ''یہ کیا بات ہوئی۔ پہلے روزے سے ہی تم نے روٹی نہ پکانے کا عذر ڈھونڈ لیا۔ اب میں کیا کھاؤں؟''

بیوی بولی ''رات کی دو روٹیاں پڑی ہیں۔ انھیں پانی لگا کر سینک دیتی ہوں۔ ساتھ ایک ولایتی اور ایک دیسی مرغی کے انڈوں کا آملیٹ بنا دیتی ہوں یا تین کھجوریں، ایک کیلا اور ایک گلاس لسی پی کر روزہ رکھ لیں۔''

''لو کر لو بات، عید ابھی دُور ہے، لگتا ہے میری کٹوتی ابھی سے شروع ہو گئی۔'' کاظمی جی ناراض ناراض سے بولے ''اس سے تو اچھا تھا کہ میں وہ چکن ہاٹ اینڈ سار سوپ پورا ختم کر لیتا۔''

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔ شگفتہ نگاری ان کی تحریر کا خاصا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں اِن کی کتاب ''چاند اور صحرا'' شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

نیاز محمد

میں جب اپنی کسی تحریر پہ احباب کے مکالمات دیکھتا ہوں تو دل کرتا ہے سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کروں۔ ایسے موقع پر میرے پسندیدہ الفاظ ممنونیت کے ہوتے ہیں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ ممنون اور حسین اکٹھے نہ ہونے پائیں۔ شاید مجھے دونوں کا ملاپ پسند نہیں یا شاید احباب کو سمجھنے میں مسئلہ ہوتا ہے، اِس لیے اپنے کلام کو حسین بنانے کے لیے مجھے ممنون کا ممنون ہونا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی دل کرتا ہے احباب کی محبتوں کا ممنون نہیں شکر گزار ہو جاؤں کیونکہ ممنون کو اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ اُنہیں کہیں جانا بھی ہوتا ہے۔۔۔ ویسے آپ کو اندازہ نہ ہو لیکن مسلسل چپ رہنے سے بھی بندہ تھک جاتا ہے۔ اِس بات کا اندازہ شاید اساتذہ خوب کر سکیں اور خصوصاً وہ اساتذہ جن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا اور ہر دو تین منٹ بعد بچوں پر رعب ڈالنے کے لیے ''اوئے چپ'' یا پھر ''شور نہیں'' کا ہنکارا لگاتے رہتے ہیں، لیکن بچے پھر بچے ہوتے ہیں، کب باز آتے ہیں باتیں کرنے سے۔

حیران ہوں کہ ایک طرف باتوں سے منع کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہم کلام نہ ہونے کو معیوب سمجھا جا رہا ہے۔ بعض لوگوں کی ایک عجیب عادت ہوتی ہے، وہ باتیں کرتے نہیں بلکہ باتیں بناتے ہیں۔ یہ اگرچہ اتنا آسان کام نہیں لیکن پھر بھی لوگ شوق سے کرتے ہیں۔ اس کے لیے کسی خام مال کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جو باتیں بے بنیاد ہوتی ہیں، وہی سب سے پائیدار ثابت ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے بنیاد کے لیے ٹھوس اور مضبوط ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن یہاں چونکہ بنیاد ہوتی ہی نہیں لہٰذا جب بھی کوئی خطرہ

ہوتے ہیں جس میں بہت لچک ہوتی ہے۔ یہ قوانین موقع و محل کی مناسبت سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ایک جاننے والے کا کہنا ہے کہ جب وہ موٹر سائیکل چلایا کرتے تھے تو وہ الگ ہی دور تھا۔ وہ اتنی سپیڈ مارتے تھے کہ کبھی ان کی بائیک کا ٹائر زمین پر لگتا ہی نہیں تھا۔ ان کے بیان کے مطابق وہ کبھی کسی رش والی جگہ پہ رکے، نہ کبھی روڈ بلاک کی پرواہ کی ہے۔ جب کہیں ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ آتی تو وہ اپنی موٹر سائیکل اڑا کر گاڑیوں کے اوپر سے گزار لیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایسی جگہوں پہ رکنا موٹر سائیکل سوار کی توہین ہے۔

موٹر سائیکل کو کبھی کبھار اپنی اصلیت کی یاد بھی آتی ہے۔ جس کا نوجوان نسل بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ وہ اس کا اگلا ٹائر اٹھا کر چلایا کرتے ہیں جسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہی اس کی اصل پہچان ہے۔ یہ بات بھی نوٹ فرمائیں کہ نوجوان نسل کے موٹر سائیکل کا گلا ہر وقت خراب رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی آواز بہت بھاری پڑ جاتی ہے۔

اس میں لگے ٹریفک کے مختلف لائٹ صرف دکھانے کے ہوتے ہیں۔ سنا ہے ان کا استعمال بالکل ممنوع ہوتا ہے اگر خدانخواستہ کہیں غلطی ہو بھی جاتی ہے تو اس کا ازالہ ناممکن ہے۔

اس کی ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ کہیں بھی کسی بھی وقت اگر ٹریفک جام ہو جاتی ہے تو کوؤں کی طرح چند سیکنڈ میں ہزاروں کی تعداد میں نمودار ہو جاتے ہیں لیکن حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ یہ اک جگہ ٹکتے نہیں اور پھر بھی کم نہیں ہوتے۔

موٹر سائیکل سے جہاز بھی بنایا جا سکتا ہے اس مقصد کے لیے اس کے سائلنسر سے جالی نکال دی جاتی ہے۔ جس سے اس کی آواز جہاز جیسی ہو جاتی ہے اور موٹر سائیکل سوار خود کو جہاز پہ سوار محسوس کرتا ہے۔ بعض لوگ ان کی سپیڈ میٹر بھی نکال لیتے ہیں تا کہ سپیڈ حد سے بڑھنے کا اندازہ نہ ہو۔ موٹر سائیکل کی سپیڈ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آئے روز کوئی نہ کوئی حد رفتار سے تجاوز کرنے پر دوسری جہاں میں پہنچ جاتا ہے۔

موٹر سائیکل کی انوکھی خوبی یہ ہے کہ اس پہ سوار ہو کے انسان اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ آج کے اس مادی دور میں ہر انسان یہی تو چاہتا ہے۔ موٹر سائیکل کو جس طرح سائیکل ثابت کرنے کے لیے ون ویلنگ کی جاتی ہے اسی طرح اس پہ تین تین چار چار لوگ بٹھا کے موٹر کار کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

موٹر سائیکل ایک ہمہ جہت ایجاد ہے، اگرچہ یہ دو چیزوں موٹر اور سائیکل کی مشترکہ شکل ہے لیکن اس سے اور بھی کئی کام لیے جا سکتے ہیں۔ اس کے پچھلے پہیے کی جگہ دو پہیے لگا کر رکشہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ آپ نے شاید نہ دیکھا ہو لیکن اس سے بیل کا کام بھی لیا جاتا ہے، اس سے کھیتوں میں ہل بھی چلایا جا سکتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے گنے کی گانیاں بھی چلاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے گھوڑے اور بیل اسے بہت دعائیں دیتے ہیں۔ رہٹ اگرچہ آج کل عام نہیں لیکن گانی کی طرح رہٹ پہ بھی اس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح گدھے اور خچر کے تمام کام بھی یہ خوشی خوشی کر لیتا ہے لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ دونوں پھر بھی ناشکرے ہیں۔

کچھ موٹر سائیکل خود کار بھی ہوتے ہیں یہ صبح اور دوپہر کے اوقات میں رکشوں اور بسوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ کچھ تو ایسے بھی ہیں جو رکشوں کے احترام میں ان سے آگے نکلنا برا خیال کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ شرف صرف ان رکشوں کے حصے میں آتا ہے جن میں صنف نازک سوار ہوں۔ اس حوالے سے ابھی مزید تحقیق ہو رہی ہے جس سے بہت جلد مزید انکشافات سامنے آ سکتے ہیں۔

نیاز محمود صاحب کا تعلق ''چھوٹا لاہور'' صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔ فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا ''قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن''۔ ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ اور افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح سے بھی رغبت ہے جو انھیں ''ارمغانِ ابتسام'' کی طرف لے آئی ہے۔

سیّد بدر سعید

صحافتی ادیب

صحافتی ادیب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ٹی وی کے لیے لکھتے ہیں، دوسرے وہ جو بیوی کے لیے لکھتے ہیں۔ ٹی وی والوں کے پیچھے پروڈیوسر جبکہ بیوی والوں کے پیچھے صرف بیوی ہوتی ہے اور وہ بھی ان کی اپنی۔ ٹی وی چینلز کے لیے لکھنے والے دور سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی مہنگی گاڑی، مہنگا موبائل، مہنگا لباس اور مہنگی محبوبہ ان کے کمرشل ادیب ہونے کا اعلان کرتے ہیں البتہ ہم جیسے لوگ انہیں کمرشل کی بجائے ''بازاری'' کہہ کر دل خوش کر لیتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ جب کوئی اعتراض کرے تو اس پر اپنی اردو دانی کا رعب ڈال کر سمجھاتے ہیں کہ اردو میں کمرشل جیسا واہیات انگریزی لفظ شامل کرنا اردو زبان کی توہین ہے۔ اس لیے کمرشل کا اُردو ترجمہ بازاری ہی ہو سکتا ہے۔ دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ہم کمرشل کو بازاری بناتے رہتے ہیں اور اسی چکر میں ساری عمر اردو سے انگریزی ترجمہ کرتے کرتے مرکھپ جاتے ہیں۔ ہمارے ایسے ہی ایک دوست ساری عمر ناک پر رومال رکھے اردو زبان سے انگریزی حروف نکالتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے موبائل کو بھی دستی ہاتف بنا دیا جو بعد میں ترقی کر کے گشتی ہاتف میں تبدیل ہو گیا۔ موبائل کو گشتی ہاتف کہنا تو ہمیں اتنا پسند نہ آیا لیکن جب ایک روز بیچ بازار ہجڑے کو ہجڑا کہہ کر چھیڑنے پر پولیس والوں نے ہماری ٹھیک ٹھاک چھترول کی تو ہم نے پیٹرولنگ پولیس کو گشتی پولیس کہنے پر اتفاق کر لیا کہ اردو میں پیٹرولنگ کا یہی مطلب ہے۔ ویسے ہمارے یہ دوست اردو کے پروفیسر تھے لیکن پروفیسر کو استاد یا ماسٹر میں تبدیل کرنے پر سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ ان کی لغت میں انگریزی کا ایک ہی لفظ ایسا تھا جسے اردو میں شامل کیا گیا اور وہ لفظ پروفیسر تھا۔

صحافتی ادیب اکثر اخبارات میں سب ایڈیٹر یا فیچر رائیٹر بن جاتے ہیں۔ ان کی اکثریت انگریزی اخبارات سے مضامین چرا کر اردو میں اپنے نام سے چھاپ لیتی ہے۔ انگریزی اخبارات والے بھی ایسا ہی کر کے حساب برابر کر لیتے ہیں۔ ان کی تنخواہ اتنی ہوتی ہے کہ ان کے ہاں آئے مہمانوں کی خبر ہمسایوں کو اپنی مرغیوں سے ملتی ہے۔ ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اخبارات کی جانب ان کے لاکھوں روپے نکلتے ہیں۔ یہ روپے ویسے ہی نکلتے ہیں جیسے بھیڑ میں جیب سے نکلتے ہیں۔ ہمارے ایک ایسے ہی دوست سے ڈاکو موبائل چھین کر لے گئے تو اس نے پولیس رپورٹ میں موبائل کے ساتھ ساتھ ۲۰ ہزار نقد بھی لکھوا دیا۔ ہم نے پوچھا یہ ۲۰ ہزار تو تمہارے پاس تھے ہی نہیں تو جواب ملا

ڈاکوؤں نے کونسا گواہی دینے آنا ہے۔

یہ اخبارات کے ہفت روزہ میگزین میں پائے جاتے ہیں اس لیے انہیں میگزین صحافی بھی کہا جاتا ہے۔عموماً ان کو ایک ایک دو دو صفحات سونپ دیے جاتے ہیں۔اپنے صفحات پر یہ تعلقات بنانے کے چکر میں ان لوگوں کا نام بھی لکھتے ہیں جو انہیں کہیں نہیں لکھتے۔ایسے لوگ عموماً کسی اچھے عہدے پر ہوتے ہیں جو ان کی وجہ سے ڈبہ ادیب بن جاتے ہیں۔یہ لوگ عموماً پرانی سی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر یا لفٹ لے کر تقریبات میں جاتے ہیں اور پھر پارکنگ میں کھڑی کسی موٹر سائیکل یا گاڑی کے شیشے میں دیکھ کر کنگھی کرتے نظر آتے ہیں۔تقریبات میں شرکت کے لیے ان کے پاس کنگھی کے ساتھ ساتھ گاڑی کی چابی بھی ہوتی ہے۔چند سمجھداروں نے موٹر سائیکل کو آلارم لاک بھی لگوایا ہوتا ہے جس کے چھلے میں کرولا کی چابی گھماتے نظر آتے ہیں۔زیادہ تر تقریبات میں پینٹ کوٹ پہنتے ہیں۔اگر پرانی تصاویر دیکھیں تو ہر تصویر میں یہی ایک کوٹ پہنے نظر آئیں گے، پینٹ البتہ مختلف ہو سکتی ہے۔ان میں اور کلرک میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ عوامی اصطلاح میں یہ صحافی کہلاتے ہیں جبکہ کلرک کو بادشاہ کہا جاتا ہے۔بیگمات سے یہ عموماً اتنا ہی ڈرتے ہیں جتنا کسی بھی شریف انسان کو ڈرنا چاہیے جبکہ بیگمات انہیں اتنا ہی ڈراتی ہیں جتنا کسی بھی صحافی کو ڈرانا چاہیے۔گھر میں بچے بھی ان کی نہیں سنتے اس لیے سنانے کا شوق دفتروں کے چپڑاسی اور ماتحتوں پر پورا کر لیتے ہیں۔چونکہ خود بھی ان سے سن لیتے ہیں اس لیے دفتر کا ماحول خراب نہیں ہوتا۔

عام طور پر یہ اپنے آپ کو استاد سمجھتے ہیں جبکہ لوگ بھی انہیں ''استاذ'' ہی سمجھتے ہیں۔ان کی کامیابی کا تعلق زبان سے ہوتا ہے چونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے چلنا ہوتا ہے اس لیے زبان چلا لیتے ہیں۔یہ بال پوائنٹ سے لکھتے ہیں جبکہ جیب میں پار کر بھی رکھ لیتے ہیں۔یہ ہر فن مولا ہوتے ہیں یہاں ہر فن سے مراد اپنی تعریفیں ہیں۔سیاست دانوں اور پولیس والوں کے خلاف کسی دباؤ میں آئے بغیر لکھتے ہیں لیکن صرف اس وقت تک جب تک ان سے براہ راست آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ان کی کوئی پیشن گوئی یا تجزیہ کامیاب ہو جائے تو کئی کئی ہفتے اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔اگر غلط ثابت ہو جائے تو خاموشی سے اپنا کام کر لیتے ہیں۔اپنی ایمانداری کا ذکر ایسے کرتے ہیں جیسے اللہ میاں پر احسان کر رہے ہوں۔یہ الگ بات کہ انہیں بے ایمانی کا موقع نہیں ملتا۔ان میں سے کچھ لوگ بڑے ہو کر کالم نگار بن جاتے ہیں اور کچھ گالم کار۔ان کی گفتگو سنیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے نامور صحافی ان کے پاس چائے پینے آیا کرتے تھے۔وقت کے ساتھ ساتھ وہ تو نامی ہو گئے جبکہ یہ چائے ہی پلاتے رہ گئے۔ایسی کہانیاں آپ اپنی ذمہ داری پر ہی سنیں کیونکہ اس کے بعد آپ کو ان کے لیے چائے منگوانی پڑے گی۔

حکومتیں گرانے میں انہیں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ہر ماہ ایسی ہی کسی حرکت پر انہیں مالکان کی طرف سے وارننگ یا جرمانے کا نوٹس موصول ہو جاتا ہے جس کے بعد چند دن دھیان سے کام کر لیتے ہیں۔ان میں سے کچھ مزاح لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ کچھ ایسے بھی ہیں جو ہماری طرح لکھتے تو سنجیدہ ہی ہیں لیکن ایسی سنجیدگی دیکھ کر لوگوں کا ''ہاسا'' نکل آتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو صحافی کا کام خبر دینا ہے جبکہ صحافتی ادیب کا کام خبر کا تیا پانچا کرنا ہے۔محلوں میں یہ دونوں کام ماسی مصیبتے مفت میں کر دیتی ہے جبکہ صحافی اس کی تنخواہ لیتا ہے۔ان کی تیلی لگانے کی عادت دیکھیں تو خیال آتا ہے کہ شاید ماسی مصیبتے اور اخباری ادیب کھمب کے میلے میں کھوئے بہن بھائی تھے۔اخباری ادیب کی کہانی سنیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان بہن بھائیوں میں زیادہ مظلوم بھائی ہے۔شاید کھمب کا میلہ پشاور میں لگا کرتا تھا۔

سیّد بدر سعید پیشہ ور صحافی ہیں۔انویسٹیگو جرنلزم ان کا میدان ہے۔نوائے وقت سے وابستہ ہیں۔کمال کے فیچر نگار ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔بہت اچھے انشاء نگار ہیں۔شستہ اور شگفتہ نثر نگاری میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔کبھی کبھار شاعری سے بھی فلرٹ کرتے نظر آتے ہیں۔بہت اچھے اور مخلص انسان ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین مصنفین میں شامل ہیں۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

تکیۂ کلام

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔۔۔

یہ مصرعہ غالباً حضرت شاعر نے کسی ناقابلِ بیان تجزیہ سے متاثر ہو کر یا کسی تکیۂ کلام سے زچ ہو کر ٹھوک دیا ہے۔ خیر شاعروں کا کیا ہے، اُن کے لئے کسی تجربے یا مشاہدے کا بیان کوئی امرِ محال نہیں۔۔۔ کشٹ تو پڑھنے یا سننے والوں کو اُٹھانا پڑتا ہے جنہیں اس کے ذخیرۂ الفاظ کو پانے اور اُن کی بوالعجبی کو سمجھنے کے لئے دوسرے سیاروں سے ''لغات'' و ''تشریحات'' کا مواد منگوانا پڑتا ہے۔ شائد ایک ماں کو اپنے نومولود بچے کو سمجھنے میں اس قدر دشواری پیش نہیں آتی جتنی کسی پڑھنے والے کو شاعر کی بات تک پہنچنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال خوش ہو جایئے کیونکہ زیرِ نظر تحریر بھی کچھ ایسے حالات سے تنگ آ کر لکھی جا رہی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنی لمبی تمہید بھی زچ کرنے کے لیے باندھی گئی ہے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ تحریر کو آخر تک پڑھنے کے بعد آپ خود بخود داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے، جس طرح حضرت شاعر کسی کی فوتگی کی اطلاع پر بھی واہ کہے بغیر رہ نہیں پاتا اور کوئی مولانا زورِ خطابت اور جذبہ منافرت سے مغلوب ہو کر ''پین دی۔۔۔'' لاحول ولاقوۃ۔۔۔ یہ بھی سننے کو ملنا تھا۔

ہمارے ایک نہایت ذہین انجینیر صاحب کا مخصوص کوڈ ورڈ یعنی تکیۂ کلام تھا۔۔۔ ''اغہ'' ''یعنی'' ''یہ''۔۔۔ اُنہیں جب کسی کو کوئی بات سمجھانی ہوتی تھی تو کہتے تھے ''اغہ یہ اغہ کو اغہ کے یہ ئی اغہ کو اغی نہ یہ اغہ جوڑ ٹی۔۔۔'' یعنی ''یہ اس طرح اس میں ایسے کر کے یہ بن جائے گی''۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ آپ ہی ایمان کی کہیئے کہ ایسی کلی کی رمزیں کون سمجھ سکتا ہے، سوائے میرے کیونکہ میں نے اُس کے اس ''اغہ'' پر پی ایچ ڈی کر لی ہے اور اب میں بخوبی سمجھ لیتا ہوں کہ اُن کے کون سے ''اغہ'' کا تعلق کس قسم کی ''یہ'' سے ہے۔

ہمارے فوجی جوانوں کو ہی لے لیں۔۔۔ تقریباً ہر فوجی کے منہ سے ہر دوسری بات کے بعد ''بہنچو۔۔۔'' کا نکلنا عام ہے اور یہ تقریباً ہر فوجی کا تکیۂ کلام ہے۔ یعنی یہاں بھی لاحول ضروری ہے۔

شائد چھاؤنیوں کی اندرونی فضا میں یہ تکیۂ کلام اس قدر راسخ ہو چکا ہے، کہ اب اسے slang بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کی ادائی ایک عمرانی فریضہ سمجھ کر کی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا تحت اللفظ ''خیر سے'' بھی ہے، مثلاً۔۔۔ وہ کہتے ہیں ''خیر سے آ گئے۔۔۔ خیر سے چلے گئے۔۔۔ خیر سے فارغ ہوں۔'' لیکن کبھی کبھی یوں بھی کہہ اٹھتا ہے۔

جب ایک صاحب سوال کرتا ہے ''آپ کے والد کی بیماری کا کیا ہوا؟''

جواب ملتا ہے ''وہ تو خیر سے فوت ہو گئے۔''

چلو جی اگے لگو۔

ہمارے پنجابی بھائی اس فن سلسلے میں خوب مالا مال ہیں۔ ایک دفعہ جہلم گیا ماموں زاد بہن کے ہاں۔۔۔ تو خلیل بھائی جو ہمارے بہنوئی ہیں کے والدِ محترم نے ایک ایسا پنجابی تکیۂ کلام ہمیں کھینچ مارا کہ میں جس کا مفہوم تلاشنے میں اب تک سرگرداں ہوں۔۔۔ بھلا کیا کہا۔۔۔ افففف اب یہ پنجابی بھائی ہی بتا سکتے ہیں کہ جب بابے نے کہا ''کنڑ کپیا'' تو میں ہونق بنا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ خلیل بھائی نے غالباً میری پریشانی کو بھانپ لیا، بولے ''بابا کہندا اسی تسیں گندم شندم نوں کٹ لیندے او؟''

ہمارے ایک دوست ہیں۔۔۔ نام تو اس کا سبحان اللہ ہے لیکن ہم نے اسے ''مسڈ کال'' سے نوازنا شروع کر دیا ہے کیونکہ یہ نام ایک تو اس کے ناٹے قد اور منحنی سے وجود پر فٹ بیٹھتا ہے۔ دوسرا اس کی انگلی کا تکیۂ کلام ''مسڈ کال'' ہو گیا ہے کیونکہ دیکھو موصوف کی جانب سے ہمارے فون پر دو تین مسڈ کالز پڑی ہوتی ہیں۔

اور ہاں۔۔۔ مستقیم شاہ المعروف ''لینڈ سکیم شاہ'' کو تو میں بھول ہی گیا۔ اس کے ہاں تاثراتی تکیۂ کلام پایا جاتا ہے۔ جب کسی سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کی زبان اور ہونٹ لرزا بر اندام رہتے ہیں یعنی بات کرتے ہوئے زبان اور ہونٹوں پر رعشہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بولتا ٹھیک ٹھاک ہے۔

بعض علاقوں کا بھی مخصوص تکیۂ کلام ہوتا ہے جیسے سوات اور مینگورہ والے ہر بات (جو) سے شروع کرتے ہیں اور اہل پنجاب (جیڑا) استعمال کرتا ہے۔ یعنی جو، جیڑا کا نعم البدل ہوا۔

ہمارے حسام الدین اے ٹی المعروف (ڈسمانی) صاحب نے تو یہ مخلوط تحت اللفظ ایجاد کیا ہے جو dismiss اور آسمان سے مل کر معطل، برباد، ختم کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ اس کا مشہور زمانہ قول ہے۔۔۔ حیاء خان کو مانیٹرنگ والوں نے ڈسمانی کر دیا ہے۔

اور تو اور مولانا باقی باللہ سکول کے دروازے پر داخل ہوتے ہی (دربار تالہ والا) دربار برخاست یعنی چھٹی۔۔۔ کا نعرۂ حق ہو بلند کر دیتے ہیں کیونکہ ویسے بھی پیر صاحب ہیں۔

اب یہاں فرض شناسی کا اعلیٰ نمونہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک خان صاحب جو ہیں تو ہمارے ہمسایہ لیکن رہتے اسلام آباد میں ہیں۔ ''اکے'' کا تکیۂ کلام اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ ہنسی چھوٹے بنا چارا نہیں ہوتا۔ پٹھان کی بولی جب بدل جاتی ہے۔ مادری زبان کا استعمال کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے تو سلمان خان گاؤں آ کر اتنی پشتو بول سکتا ہے۔

''اکے نو دا ٹرانسفر مرا کے سارا خراب شو۔'' یعنی ٹرانسفر مر تو جل گیا ہے۔

ایک تو اس ''ہیں جی، ہیں جی'' نے ناطقہ بند کر رکھا ہے جو اکثر اہلِ زبان بے تکان بولتے ہیں۔ ہندوستان کم از کم ہم سے تھری ڈی اینیمیٹڈ فلموں میں صرف اس تحت اللفظ سے بازی لے گیا ہے جو موٹو۔۔۔ خالی پیٹ دماغ کی بتی نہیں جلتی۔۔۔ چتلو۔۔۔ آئیڈیا۔۔۔ ڈاکٹر جھٹکا۔۔۔ پاپڑ والے۔۔۔ قصیدہ رام۔۔۔ اوڑی بابا اور انسپکٹر چیونگم۔۔۔ چیونگم کے چنگل سے بچنا ایمپوسبل بولے تو ایمپوسبل۔۔۔ ہمارے بچوں کی عادت ثانیہ بنا چکے ہیں۔ اب لاکھ پاکستان الہ یار اینڈ دی لیجنڈ آف مارخور لانچ کرتا پھرے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی میں ہندو بنیا آگے جا رہا ہے کیونکہ فیس بک بھی برصغیر میں ہندوستان سے ہی کنٹرول کیا جا رہا ہے۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوند خوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ شاعری اور مضمون نگاری ان کا میدان ہے۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ ففٹی ففٹی ہوتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل کرم فرما ہیں۔

اقبال حسن آزاد

لیلائے سیاست

وہ دن ہوا ہوئے کہ سیاست حب وطن، خدمت خلق اور ایثار وقربانی سے عبارت ہوا کرتی تھی۔ زمانے کی ہوا ایسی بدلی کہ ہواؤں میں اُڑنے والوں کی ہوا نکل گئی اور جو کل تک ننگ وطن اور قانون شکن کی حیثیت سے جیل کی ہوا کھاتے تھے وہ ہوا پانی بدلنے کے لئے ہواؤں میں اڑتے ہوئے کسی ہوادار مقام پر چلے جاتے ہیں۔

بہر کیف! آج کی نیتاؤں کی بلند پروازی، سماجی حیثیت اور کشادگیٔ رزق دیکھ کر ہمارے دل میں بیک وقت حسد اور رشک جڑواں بھائی کی طرح پیدا ہوئے اور ہم بھی لیلائے سیاست کی تسخیر کے طریقوں پر غور کرنے لگے مگر چونکہ زمانے سے ہمارے دل کے پاس پاسبان عقل کی جگہ خالی ہے اس لئے ہمارے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آسکی۔ آخرش ہم نے اپنے دیرینہ دوست سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا جو مشورے دینے میں ماہر ہیں۔ موصوف کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق اور فکر ونظر غیر معمولی ہے۔ میری عرض سن کر پہلے تو انہوں نے میری جانب بنظر استعجاب دیکھا اور پھر بولے۔

''حضرت! یہ آپ کس کا فرادا کے چکر میں پڑ گئے۔ آپ شریف آدمی ہیں۔ کیوں مفت میں بدنام ہونے کی سوچ لی ہے۔ یہ آپ کے بس کی چیز نہیں۔ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔''

موصوف کی بات سن کر ہم سمجھ گئے کہ وہ ہمیں Demoralise کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہمارے دوست پر غالبؔ کے اس شعر کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''جناب ! آپ لیلائے سیاست کی فتنہ سامانیوں سے واقف نہیں۔ لیلائے سیاست کا مجنوں بھی قیس کی مانند کبھی سنگسار ہوتا ہے تو کبھی پا بہ زنجیر، کبھی صحرانوردی پر مجبور ہوتا ہے تو کبھی جلاوطن قرار دیا جاتا ہے مگر لیلیٰ لیلیٰ پکارنے سے باز نہیں آتا اور ایک عاشق صادق کی مانند اپنے معشوق کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے ہمہ وقت اور ہمہ تن حاضر رہتا ہے۔ لیلائے سیاست کبھی پکے نمازیوں کی نماز چھڑ وادیتی ہے تو کبھی بے نمازیوں سے نماز پڑھوا دیتی ہے۔ کسی کے سر سے ٹوپی اتار دیتی ہے تو کسی کے سر پر ٹوپی پہنا دیتی ہے۔ یہ اپنے عاشق کو کبھی مزارات پر سجدہ ریز کر دیتی ہے تو کبھی یگیہ میں شامل ہونے کے لئے مجبور بنا دیتی ہے۔ کبھی بائیں بازو والے اشتراکیوں کو عبادت گاہوں میں پہنچا دیتی ہے تو کبھی دائیں بازو والے کٹر پنتھیوں کو افطار پارٹی کروا دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن یوں بناتی ہے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ ویسے بھی سیاست میں نہ مستقل دوستی ہوتی ہے نہ مستقل دشمنی۔ اور یوں بھی آج کل سمیکرن کا زمانہ ہے۔ کب کون نیتا کس پارٹی میں شامل ہو جائے اور کب کون سی پارٹی کس پارٹی سے تال میل بٹھا لے کہا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی اور نظریاتی یا سیاسی اختلافات کے باوجود مختلف پارٹیوں کے نیتا جب کسی محفل میں یکجا ہوتے ہیں تو ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ہی ٹیبل پر کھانا کھاتے ہیں اور ایک ہی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہوتے ہیں۔''

ہم موصوف کی تقریر دل پذیر سن کر حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ سچ پوچھئے تو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ہماری بولتی بند ہوگئی۔ موصوف کہتے رہے ''لیلائے سیاست کے در تک رسائی حاصل کرنے کے لئے عشاق طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ مشاعرے سے لے کر مذاکرے تک اور میلاد سے لے کر اکھاڑے تک ہر قسم کی تقریبوں میں شریک ہوتے ہیں اور اپنی موجودگی درج کرواتے ہیں تاکہ ان کی عوامی شبیہہ برقرار رہے۔ وہ قبرستان اور شمشان سے یکساں طور پر دلچسپی لیتے ہیں تاکہ ان کی

مذہبی رواداری، وسیع المشربی اور کشادگی قلب مترشح ہو۔ وہ اپنے علاقے کے ایم ایل اے اور ایم پی کے پیچھے حقہ بردار بن کر گھومتے ہیں۔ وہ اخبار نویسوں سے سانٹھ گانٹھ کر کے تصویر کھنچواتے ہیں اور اخبار میں اپنا نام شائع کرواتے ہیں۔ دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

عشق ''لیلائے سیاست'' نے تو اس مجنون کو
اِتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اور وہ بے چارے اس امید پر جیتے ہیں کہ ایم ایل اے کی کرسی نہ سہی کسی کھادی گرام ادیوگ، کسی سنی وقف بورڈ یا کسی اکادمی کی چیرمینی یا کم ازکم ممبری ہی مل جائے۔''

ہم نے کہا ''حضور! آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ ہم نے خود اپنی گناہگار آنکھوں سے ایسے کئی نظارے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ پانے سے قاصر ہیں کہ وہ کیوں کر ایسا کر پاتے ہیں۔ یقیناً ان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں ہوتی ہوں گی۔''

موصوف نے ہماری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا ''بے شک! آپ کا اندازہ درست ہے۔ سیاست داں بننے کے لئے چند اوصاف حمیدہ و خصلت پسندیدہ کا ہونا ضروری ہے۔''

ہم نے پوچھا ''مثلاً؟''

کہنے لگے ''ایک کامیاب سیاست داں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کا جسم تو گرم و خشک رہتا ہو مگر دماغ سرد و تر۔ سیاست ایک ایسا مذہب ہے جس میں غصہ حرام ہے۔ آپ کو برسر عام گالیاں دی جا رہی ہیں اور آپ ہیں کہ مسکرائے جا رہے ہیں۔ لوگ آپ کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں اور آپ دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی آپ کے ایک گال پر چانٹا مارتا ہے تو آپ جھٹ دوسرا گال پیش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں آج تک گاندھی جی سے بڑا politicain پیدا نہیں ہوا۔''

ہم نے کہا ''واہ! واہ! آپ کے مشاہدے کا جواب نہیں۔''

موصوف نے خوش ہو کر سر خم کیا اور پھر کہنے لگے ''سیاست داں کا دوسرا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کپڑے اتروانے میں کبھی شرم محسوس نہیں کرتا خواہ وہ شموئل احمد کے افسانے ''ایڈز'' کی مسز کمد چگانی کا بیڈ روم ہو یا امریکہ کا کینڈی ایئرپورٹ۔''

اس بار مسکرانے کی باری ہماری تھی۔ ہماری مسکراہٹ شاید انہیں پسند نہ آئی جھنجھلا کر بولے ''آگے سنئے، سیاست داں کی تیسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ Talented ہو اور اس نے جیل کی ہوا ضرور کھائی ہو۔ کسی نیتا کے لئے یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ وہ کبھی جیل نہ گیا ہو۔ کیس جتنا زیادہ سنگین ہوگا نیتا اتنا ہی قد آور سمجھا جائے گا۔ حوالہ، گھوٹالا، مرڈر، ریپ وغیرہ تو تھرڈ گریڈ کے نیتاؤں کا مشغلہ ہے۔ اگر کسی نیتا پر فساد کروانے اور عبادت گاہوں کو ڈھانے جیسے الزامات ہوں تو کیا کہنے اور اگر اس پر ملک دشمنی کا الزام ہو تو سونے پہ سہاگہ۔''

ہم اپنے مشیر بے نظیر کی باتیں سن کر کچھ بدحواس تو ضرور ہوئے مگر ہمت یکجا کر کے یوں گویا ہوئے ''آپ تو یہ سب درجہ اول کے نیتاؤں کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔''

صف اولین تو ہے خاص صف وہاں پاؤں جائے کہاں شرف
صفِ آخریں سے بھی دور تک جو نظارا ہو تو وہی سہی

ہم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''دیکھئے! نام تو ہمارا اقبال ہے مگر اقبال مندی تمام تر نیتاؤں اور ان کے چمچوں کی حصے میں چلی گئی ہے۔ اس ناچیز کو کوئی ایسا تیر بہدف نسخہ مرحمت فرمایئے کہ لیلائے سیاست ہمارے پہلو میں آ جائے اور ہم کو ہر مراد حاصل کر کے شادکام ہو جائیں۔''

موصوف کسی وزیر باتدبیر کی طرح آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے ۔ چند ساعتوں بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں، اٹھے۔ اندر گئے اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مرتب کردہ تصنیف ''رضا نقوی واہی۔ آئینہ در آئینہ'' لا کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ پھر انہوں نے اس ضخیم کتاب کے صفحے پلٹے اور ایک نظم ہماری آنکھوں کے سامنے کر دی۔ عنوان تھا ''لیڈری کا نسخہ۔'' نظم پڑھ کر ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اللہ اللہ! شاعر بھی کیا خوب مخلوق ہے۔ کسی اہل دانش نے سچ فرمایا ہے کہ ''شاعری جزو پیغمبری است'' رفاع عام کیلئے نظم پیش خدمت ہے۔ امید کہ لیڈر بننے کے خواہش مند

افراد اس نسخے سے استفادہ فرمائیں گے اور ہمیں دعائیں دیں گے اور واہی صاحب کے لئے دعائے مغفرت کریں گے۔

ملاحظہ فرمایئے۔

وہ لوگ آج کل جنھیں فکر معاش ہے
آسودگی زیست کی جن کو تلاش ہے
اس کے عوض کہ جا کے کہیں نوکری کریں
واہی کا مشورہ ہے کہ وہ لیڈری کریں
معجون لیڈری کا بڑا کامیاب ہے
نسخہ یہ کسب زر کے لئے لا جواب ہے
انمول ہے یہ جنس تجارت کے واسطے
ترکیب لکھ رہا ہوں سہولت کے واسطے
ایمان اور ضمیر کو پہلے کھرل کریں
اور اس کے بعد خون حمیت میں حل کریں
تخم ریا کو عقل کے کانٹے پہ تول لیں
سازش کا زہر شہد فصاحت میں گھول لیں
بادام خلق و پستہ تہذیب پیس لیں
دونوں کو خوب سل پہ شقاوت کے پیس لیں
سچ میں سفید جھوٹ کا پانی ملائیں پھر
حرص وہوس کی آنچ پہ سب کو پکائیں پھر
جو شاندہ جب ابال پہ آئے اتار لیں
اور اس کو پھر دماغ کی بوتل میں گار لیں
قند سیاہ فرقہ پرستی ملائیں پھر
اور کوشش ضعیف کو اپنی کھلائیں پھر
بیمار کو غذائے مقوی بھی چاہئے
مرغ ہوس کی تھوڑی سی یخنی بھی چاہئے
انڈے بھی کچھ حسد کے ہوں لحم خودی کے ساتھ
دونوں کو کھائیں بغض و عداوت کے گھی کے ساتھ
دیکھیں دوا کا معجزہ فضل خدا سے پھر
بیمار نا امید نہ ہو گا شفا سے پھر
ہمت کا خوں رگوں میں اچھلنے لگے گا پھر
عزم ضعیف اٹھ کے ٹہلنے لگے گا پھر
ٹھوکر ے اپنی فتنۂ محشر جگائے گا
او رملک پر عذاب خدا بن کر چھائے گا
تخم ہوس سماج کو کھیتی میں بوئے گا
طوفان بن کے قوم کا بیڑا ڈبوئے گا
پھر تو قدم کو چومے گا اقبال باربار
قربان اس پہ ہوں گے مہ وسال بار بار
دولت کنیز بن کے خواصی میں آئے گی
بھی خود اس کے ماتھے پہ چندن لگائے گی

نظم پڑھ کر ہم نے اپنی سانس کی آمد و رفت کو محسوس کیا اور شکر ادا کیا کہ ابھی درِ توبہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم نے تو لیلائے سیاست کے کوچے میں قدم رکھنے سے توبہ کر لی مگر ہماری دلی خواہش ہے کہ ہمارے حلقے کا کوئی جواں مرد اس محشر ساماں اور فتنہ دوراں کو زیر دام کر لے اور فاتحین میں اس کا شمار ہو، تاکہ ہم بھی جناب رضوان احمد کی طرح ''قومی تنظیم'' میں ایک کالم لکھ اس سے اپنی قربت کا اعلان کرتے ہوئے اس کی مدح سرائی کریں اور ہو سکتا ہے کہ وہ خوش ہو کر کسی ادارے سے میرے مسودے کی اشاعت کے لئے مالی امداد دلوانے کی سبیل پیدا کر دے اور پھر میں اپنی مطبوعہ کتاب کے پیش لفظ میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ وہ مزید خوش ہو کر اس کتاب کی سو پچاس کاپیاں سرکاری اداروں میں فروخت کروا دے اور میں حاصل شدہ رقم سے دوسری کتاب چھپوانے کی سوچ لوں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اقبال حسن آزاد کا تعلق صوبۂ بہار (ہندوستان) سے ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مونگیر میں مقیم ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک افسانوں کے تین مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس (۲۰۰۵ء)، ''مردم گزیدہ (۲۰۰۵ء) اور ''پورٹریٹ'' (۲۰۱۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ''اوس کے موتی'' زیرِ ترتیب ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے دیرینہ کرمفرما ہیں۔

حافظ مظفر محسنؔ

بک سٹال پر کتب بینی

میں اور خرم گاڑی میں بیٹھے مدثر بھٹی کا انتظار کر رہے تھے، تقریباً آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ گجرات میں سردی پڑے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہوائیں مری سے آ رہی ہیں، گرمی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے ملتان والوں نے کوئی بڑی کھڑکی کھول دی ہو۔ گجرات کے گرد و نواح میں لوگ دسمبر جنوری میں روٹی کی بجائے اکثر کینو کھا کر گزارہ کر لیتے ہیں، جیسا کہ ملتان میں جون جولائی میں سب کام ''آم'' سے ہی ہوتے ہیں، حکیم بھی آم کھا رہا ہوتا، مریض بھی آم کھا رہا ہوتا ہے اور عوام کا رویہ بھی آم جیسا میٹھا ہوا ہوتا ہے اور ہم لکھاری حضرات کو ایسے میں مرزا غالبؔ یاد آ رہے ہوتے ہیں جو اپنی آم خوری کے ہاتھوں جانے جاتے تھے پہچانے جاتے تھے۔

پچھلے سال ایک صاحب نے بوری بھر کے مجھے کینو تحفے میں بھیجے۔ میں کسی کام سے لاہور جا رہا تھا، فون پر ''بوری کی آمد'' کی اطلاع ملی تو میں نے چوکیدار فیاض کو کہا'' یہ کینو سنبھال کے رکھ لو میں منگل والے دن واپس آؤں گا۔ تم بھی اگر دل کرے تو کچھ کینو میرے آنے تک استعمال کر لینا۔''
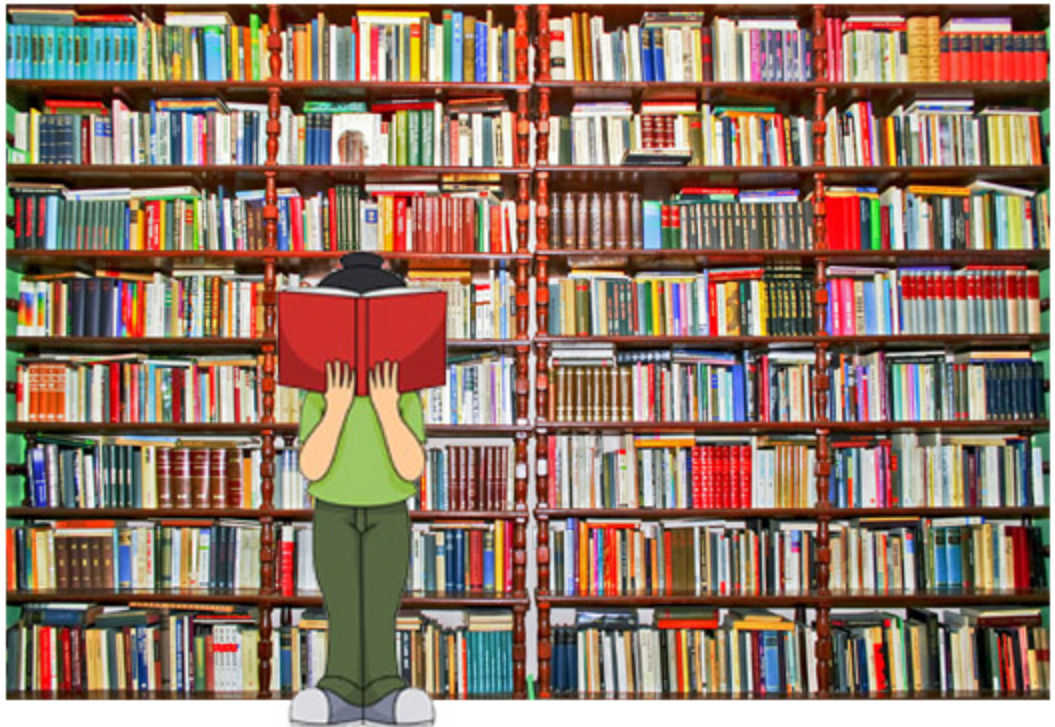
''باقی کے کینو دوستوں کو بھجوادوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میں منگل کو آیا تو ہر طرف کینو کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے کہا ''فیاض میاں۔۔۔کینو لے آؤ!''

فیاض نے تین کینو پلیٹ میں رکھ کے مجھے پیش کیے۔

''باقی کے سنبھال لو!'' میں نے غیر ارادی طور پر کہا تو فیاض حیرت سے بولا ''باقی کون سے کینو؟''

میرے استفہامیہ انداز پر اُس نے نہایت سنجیدگی سے بتایا۔ ''سر دس بارہ کینو خراب نکلے، چوراسی میں نے کھالئے یہ تین بچے تھے یہ آپ زہر مار کر لیں!''

میں نے غصے میں کمر پر خارش کر ڈالی حالانکہ مجھے اُس وقت خارش گھٹیا خضاب استعمال کرنے کے باعث سر میں ہو رہی تھی۔

راجہ صفدر سے جب بھی کیلے کی بات ہو، وہ ہمیں کیلے کے حوالے سے اپنی ''آپ بیتی'' ضرور سنا ڈالتے ہیں۔ راجہ صفدر کے دوست میاں منان کو ایک دفعہ راجہ صاحب سے کوئی کام پڑ گیا۔ راجہ صفدر مٹھائی کم کھاتے ہیں بلکہ کہہ لیں کہ اُنھیں مٹھائی پسند نہیں۔ میاں منان نے آتی دفعہ فون کیا ''راجہ صاحب قلاقند کھائیں گے یا لڈو۔''

''نہیں۔۔۔ہم تو میاں صاحب پھل سبزی کھانے والے ہیں!''

غیر ارادی طور پر جاری کردہ راجہ صاحب کا یہ بیان اُن کے گلے پڑ گیا۔ میاں منان صاحب آئے۔ راجہ صاحب نے کام کر دیا۔ جاتے ہوئے میاں صاحب نے ملازم سے کہا ''یار گاڑی سے پھل نکال لاؤ!''

پھل ڈیوڑھی میں رکھ دیا گیا۔ مہمان چلے گئے۔ راجہ صاحب نے چیک کیا تو پچاس درجن کیلے ڈیوڑھی میں پڑے تھے اور ایک بڑا پیکٹ ''کدو'' کا بھی موجود تھا۔

میں گیا تو سامنے دس بارہ درجن کیلے بڑی ٹرے میں رکھ دیئے گئے۔ میں نے حسب عادت دو تین کھائے۔ راجہ صاحب کے سخت اصرار پر دو تین اور کھا ڈالے۔ اُٹھنے لگا تو راجہ جی نے چار پانچ درجن اور چھ سات ''کدو'' بڑے شاپر میں ڈال کر دیئے اور بولے ''بچوں کے لیے لے جائیں۔۔۔ پھل سبزیاں صحت کے لیے اچھی ہوتی ہیں۔''

جس دوست سے ہفتہ بھر بات ہوئی، سب ''کیلے'' انجوائے کر رہے تھے ''کدو'' استعمال کر رہے تھے۔

ایک ہفتہ بعد میں کسی کام سے راجہ صفدر کے گھر گیا تو اتفاق
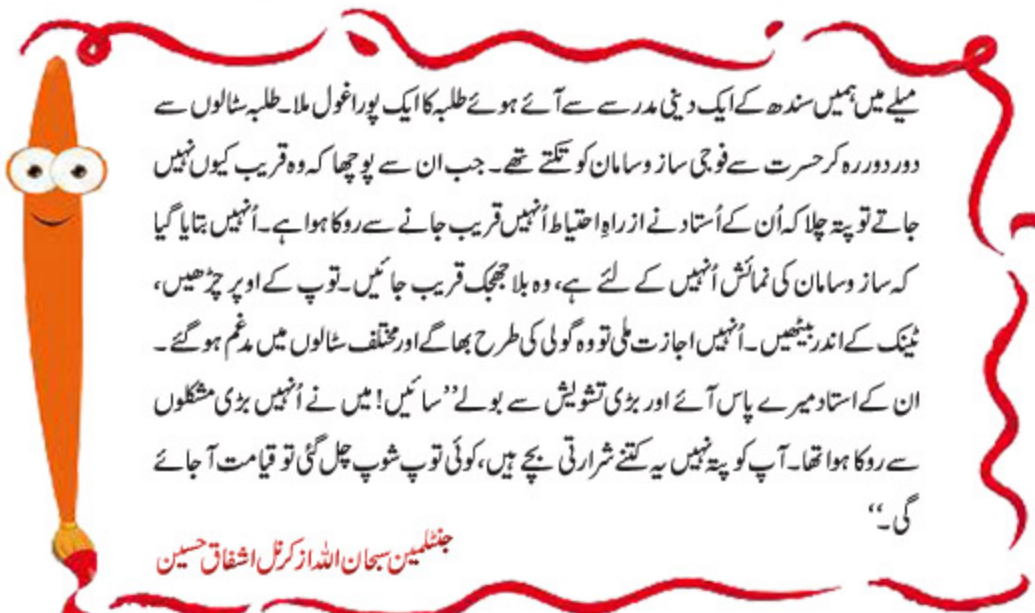
میلے میں ہمیں سندھ کے ایک دینی مدرسے سے آئے ہوئے طلبہ کا ایک پورا غول ملا۔ طلبہ سٹالوں سے دور دور رہ کر حسرت سے فوجی ساز و سامان کو تکتے تھے۔ جب ان سے پوچھا کہ وہ قریب کیوں نہیں جاتے تو پتہ چلا کہ اُن کے اُستاد نے ازراہِ احتیاط اُنہیں قریب جانے سے روکا ہوا ہے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ ساز و سامان کی نمائش اُنہیں کے لئے ہے، وہ بلا جھجک قریب جائیں۔ توپ کے اوپر چڑھیں، ٹینک کے اندر بیٹھیں۔ اُنہیں اجازت ملی تو وہ گولی کی طرح بھاگے اور مختلف سٹالوں میں مدغم ہو گئے۔ ان کے استاد میرے پاس آئے اور بڑی تشویش سے بولے ''سائیں! میں نے اُنہیں بڑی مشکلوں سے روکا ہوا تھا۔ آپ کو پتہ نہیں یہ کتنے شرارتی بچے ہیں، کوئی توپ شوپ چل گئی تو قیامت آ جائے گی۔''

جنٹلمین سبحان اللہ از کرنل اشفاق حسین

سے میاں منان کا فون آ گیا۔ راجہ صاحب سے پوچھا گیا ''راجہ صاحب کیا رہے ہیں؟''

''میاں صاحب آپ جو پچاس ساٹھ درجن کیلے چھوڑ گئے تھے، صبح دو پہر شام وہ کھاتے چلے جا رہے ہیں، آپ کو یاد کر رہے ہیں؟''

میں اور خرم سردی میں ٹھٹھر رہے تھے کہ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ مدثر بھٹی کہہ کر گیا تھا کہ میں ایک کتاب لے کر آتا ہوں آپ دو منٹ wait کریں! wait جب ایک گھنٹہ کرنا پڑا تو خرم بھی بن کچھ کہے مدثر بھٹی کے پیچھے بکسٹال میں جا گھسا۔ دس پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو میں سیٹ پر بیٹھا ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ خرم بھی آرام سے چپکے سے آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مدثر بھٹی آیا تو پیچھے ایک بندہ غصے میں بھاگتا آیا۔

''سو روپے اور دو۔۔۔ سو روپے اور دو!'' وہ شخص زور زور سے چلا رہا تھا۔

''کیا بات ہے میاں، کیوں پیچھے پڑے ہو شریف آدمی کے؟''

''آپ چپ رہیں جی۔'' اُس شخص نے مجھے ڈانٹا۔

میں نے بھی حسب معمول بدتمیزی کی اور بات بڑھ گئی۔ لوگ اکٹھے ہوگئے تو اُس شخص نے بتایا کہ ''یہ صاحب (مدثر بھٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دو گھنٹے پہلے میری دوکان پر تشریف لائے کتاب ''حلال رزق مشکل کام'' کھولی اور پڑھنے بیٹھ گئے۔۔۔ دو گھنٹے بعد میں نے عرض کی حضور ۵۰۰ روپے کی کتاب ہے آپ نے آدھی ہمارے بکسٹال پر ہی بیٹھ کر پڑھ ڈالی ہے کتاب مجھے واپس کریں، اڑھائی سو روپے دیں اور جائیں کیونکہ یہ بکسٹال ہے، لائبریری نہیں۔۔۔ یہ صاحب سو روپے پھینک کر بھاگ نکلے۔'' وہ صاحب غصے میں بولے۔

لوگوں نے مدثر بھٹی سے چار سو روپے مزید لے کر بکسٹال کے مالک کو دیئے اور کتاب مدثر بھٹی کو تھما دی۔ معاملہ تو رفع دفع ہو گیا لیکن بھٹی صاحب نے خرم کے ساتھ کلام بند کر دی، گاڑی چلتی رہی اور گھمبیر خاموشی چھائی رہی۔

کھاریاں کے قریب میں نے بھٹی سے ناراضگی کی وجہ پوچھی تو غصے میں بولے (پریشان بھی تھے ویسے) ''میں نے پندرہ بیس منٹ میں کتاب مکمل پڑھ لینی تھی بکسٹال پر کھڑے کھڑے، یہ آپ کے چہیتے نے کام خراب کر دیا۔'' خرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھٹی نے غصے سے کتاب ''سنبھالتے'' ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا تو خرم زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

''گویا یہ آپ نے سازش کی، ورنہ اب کی بار بھی مدثر بھٹی نے کتاب مفت پڑھ ڈالنے کا ریکارڈ قائم رکھنا تھا۔'' میں نے خرم کو سمجھایا۔

افسوس کہ ہم میں سے اکثر کتاب رسالے اور اخبارات تو خاص طور پر بکسٹالوں پر کھڑے کھڑے پڑھ ڈالتے ہیں اور بے چارے بکسٹال والے اور خاص طور پر لکھاری اپنی چھپی ہوئی کتابیں سنبھال سنبھال کر پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ ایک تو ہمارے ہاں کتاب سے محبت کا معاملہ تقریباً ختم ہو چکا ہے اوپر سے لوگوں کی ہمارے ہاں اکثریت کتاب کے حوالے سے مدثر بھٹی بن چکی ہے، جبھی تو نئی بڑی بڑی خوبصورت موٹی موٹی کتابیں پرانی انارکلی کے گردتھڑوں پر ٹکے ٹوکری مل رہی ہوتی ہیں اتوار کی شام اور ہم جیسے ہزاروں روپے والی کتاب سو روپے میں لے کر خوش ہوتے ہیں۔۔۔ ہے ناں پریشانی والی بات؟

حافظ مظفر محسن کا تعلق لاہور سے ہے۔ بچپن سے لکھ رہے ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں اِن کی خدمات گراں قدر ہیں۔ طنز و مزاح اِن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح پر مبنی اِن کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں، ایک عدد شاعری کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ لاہور کے ادبی محافل میں خاصے متحرک ہیں۔ برقی مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے اِن کی محبت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

تحریفی چوری

ظرف ہو اہلِ ظرافت کا بلند
پر نہ ہو "مِسٹیک" تو "سوری" نہ کہہ
مالِ مسروقہ تو یہ پہلے ہی ہے
شعر میں تحریف کو چوری نہ کہہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

حوا + لات

صبح کا ناشتہ اک کڑوی کسیلی چائے
سارا دن ڈانٹ ڈپٹ بیوی سے سنتے جائیں
قید محدود کہیں پر ہے، کہیں لا محدود
گھر کے حالات، حوالات سے ملتے جائیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کراچی کی ٹریفک جام

جو پہنچے ہم کراچی تو عجب رنگینیاں دیکھیں
بلندی آسماں جیسی زمیں سی پستیاں دیکھیں
بتائیں شہر کے کیا کوچہ و بازار کے منظر
ٹریفک جام اتنا تھا فقط چورنگیاں دیکھیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گلی گلی

سو رہے تھے گلی میں اور چپل
چور کی بغل میں دبی دیکھی
اک گلی میں وہ کیا گھسا عاصی
"شہر کی پھر گلی گلی دیکھی"

مرزا عاصی اختر

تسکینِ دل

اپنی چرب زبانی سے کیا کچھ نہ پا لیا
جھگی کو لات مار کر بنگلہ سجا لیا
"تسکین دل کا ہم نے یہ ساماں بنا لیا"
جتنا ادھا جس سے ملا لے کے کھا لیا

مرزا عاصی اختر

آزار

عجب آزارِ دل کش ہو گیا ہے
مری بیگم پہ جو بھاری ہے اب تک
پڑوسن کو سمجھ لیتا ہوں بیوی
وہی آنکھوں کی بیماری ہے اب تک

مرزا عاصی اختر

کہیے سرکار

ان کے در پر جو گنگنانا ہوا
پمپیوں کا یہ سر نشانا ہوا
ان کی اماں یہ پیار سے بولیں
"کہیے سرکار کیسے آنا ہوا"

مرزا عاصی اختر

لوڈ شیڈنگ

لوڈ شیڈنگ کا تسلسل اف خدا
ہے طبعیت سخت برہم کیا کریں
دے رہے ہیں واپڈا کو گالیاں
"دل ہی قابو میں نہیں ہم کیا کریں"

مرزا عاصی اختر

پچھتا رہا ہوں

عادت کی اور بات ہے دل کی بری نہیں
رہتی نہیں وہ مجھ کو برادر کہے بغیر
پچھتا رہا ہوں نرس کو بیوی بنا کے میں
سنتی نہیں ہے بات جو سسٹر کہے بغیر

مرزا عاصی اختر

حقِ ہمسائیگی

یا خدا کیسے ہیں یہ ہمسائے
دن میں دس بار جن کا آنا ہوا
قرض، اخبار، سی ڈیاں، جھاڑو
ان کو لوٹائے اک زمانہ ہوا

مرزا عاصی اختر

جیسی کرنی ویسی بھرنی

بہو کی سن سن کے بذلہ سنجی
بھڑ کے کیوں تلملا رہی ہو
ہمیں بھی سب کچھ ہے یاد بیگم
جو تم نے بویا تھا، پا رہی ہو

مرزا عاصی اختر

رویتِ ہلال

انھوں نے کامیابیوں کا تیز سے یہ تیز تر
کیا ہے کس طرح سفر، خبر نہیں خبر نہیں
ہمیں تو چاند عید کا بھی دیکھنا محال ہے
گئے وہ کیسے چاند پر، خبر نہیں خبر نہیں

مرزا عاصی اختر

کنڈے

بنا کر ہزاروں کے بل بھیجتے ہو
قیامت سی گھر گھر مچائی ہوئی ہے
مرا گھر ہے روشن جو کنڈے کے دم سے
یہ چوری تمھی نے سکھائی ہوئی ہے

مرزا عاصی اختر

ترکی بہ ترکی

ترکی بہ ترکی دے کے گئی ہے مجھے جواب
مٹی میں آرزو کو ملا کر چلی گئی
میں نے سوالِ وصل سے اُس کو ہلا دیا
وہ میرے چار دانت ہلا کر چلی گئی

مرزا عاصی اختر

شاخسانہ

اپنی بیگم کا تھا گماں اُن پر
آزمانا ہے لوڈشیڈنگ کا
ہوں جواب ہسپتال میں داخل
شاخسانہ ہے لوڈشیڈنگ کا

مرزا عاصی اختر

دن میں تارے

قرض خواہوں نے آ کے عید ملی
دل کے ارمان ہمارے نکلے
رات میں تارے نکلتے ہی ہیں
آج تو دن میں بھی تارے نکلے

مرزا عاصی اختر

فضلِ ربی

عید کا دن فضل ربی کی بہار
کون پھر دے گا دہائی آم کی
روزے لے آتے ہیں تایا ٹوکری
ہیں بہت شوقین تائی آم کی

مرزا عاصی اختر

عیدڈنر

بیگم کی دوستوں نے کیا کام سب تمام
ان کے ہی نقش پا ہیں جہاں دیکھتا ہوں میں
ہے غارت، کچن میں یقیناً انہی کا ہاتھ
چمچوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں

مرزا عاصی اختر

ٹی ٹی کی نوک پر

اتنی سی برف مجھ کو ملی تھی پچاس کی
اک شخص کیسی مجھ کو پریشانی دے گیا
لے جاتا مجھ سے میرا موبائل تو غم نہ تھا
ٹی ٹی کی نوک پر وہ مری برف لے گیا

مرزا عاصی اختر

کے الیکٹرک

کے۔الیکٹرک کی مہربانی ہے
اور کتنوں کی جان جانی ہے
زندگی عارضی سہی لیکن
برف مل جائے جاودانی ہے

مرزا عاصی اختر

سقراط

آج بازار میں اک آگ لگی ہے ہر سُو
ایسی مہنگائی سے ہم سب کو بچایا جائے
وہ گرانی ہے کہ ہر شخص یہی کہتا ہے
''میں ہوں سقراط مجھے زہر پلایا جائے''

مرزا عاصی اختر

ساڑھی

کہا میں نے یہ بیگم سے اٹھانا مجھ کو سحری میں
وگرنہ کل کا روزہ بھی مرے ہاتھوں سے جائے گا
جواب آیا، اگر تم آج بھی ساڑھی نہیں لائے
بھلا میں کیا اٹھاؤں گی خدا تم کو اٹھائے گا

مرزا عاصی اختر

کپڑے کی دوکان

افسوس! تھان سینکڑوں دکھلائے پر تمھیں
راغب نہیں کیا کسی کپڑے کی دید نے
عورت یہ بولی کیجیے افسوس کس لیے
ویسے بھی میں تو آئی تھی سبزی خریدنے

مرزا عاصی اختر

چکنی حجامت

کہا ماں نے کتنی بڑھاؤ گے زلفیں
خوش آتی نہیں مجھ کو عادت تمھاری
ارے نائی کو چھوڑو لیڈر کو پکڑو
کرے گا وہ چکنی حجامت تمھاری

مرزا عاصی اختر

کھسرے

سنا ہے اس الیکشن میں بھی عاصی
یہاں کچھ درمیانے آ رہے ہیں
ابھی پچھلوں نے کیا کچھ کم نچایا
جو، اب کھسرے نچانے آ رہے ہیں

مرزا عاصی اختر

نون لیگ

اب لیگ میں جو ''نون'' ہے، اس سے ہے کیا مراد؟
اس سے نہیں ''نواز'' تو ''نا اہل'' کیا ہے یہ؟
جن کی زبان لمبی ہے، سب کو لگام دو
توہین عدلیہ کا عجب ماجرا ہے یہ!

تنویر پھول

عمران (صنعتِ تجنیسِ خطی)

تیسری شادی ہوئی تو پوچھا یہ سسرال نے
عُمر ان کی کیا ہے ؟ یعنی کیپٹن عمران کی
''عمر'' کے ہے بعد ''ان''، قیمت پچاس اور ایک ہے
دیکھنے میں عمر لگتی ہے یہی کپتان کی [1]

تنویر پھول

پا، کس، تان

اپنے پاکستان کا مطلب یہی سمجھے ہیں لوگ
پیر چومو پیر جی کے، سوؤ لمبی تان کر
اتحاد ، ایمان ، تنظیم و عمل ہے لازمی
اے ہماری عدلیہ! ایسا کوئی اعلان کر

تنویر پھول

[1] بحساب ابجد ''الف'' کی قیمت ایک اور ''ن'' کی قیمت پچاس (دونوں کا مجموعہ ۵۱)

پاخانہ، پیشاب

فارسی پڑھنے لگا تو ایک لڑکے نے کہا
"پاؤں کا گھر" کون سا ہے؟ اس کو کیا کہتے ہیں آپ
اور یہ "آگے کا پانی"، اس کا مطلب کیا ہے جی!
برف، پانی سے بنے اور پانی ہی بن جائے بھاپ

تنویر پھولؔ

بالا یا کالا

نامزدگی بک رہی تھی لوٹی دولت کے عوض
پھر بھی کوئی پارسا ہے، کوئی اعلیٰ ہو گیا!
بن کے چمگادڑ ہیں چمٹے سیٹ سے قزاق بھی
ملک میں ایوانِ بالا آہ! کالا ہو گیا

تنویر پھولؔ

کاغذاتِ نامزدگی

نامزدگی بکی کروڑوں میں!
چاہتے کرسی یہ مداری ہیں
نامزدگی نہیں، انھیں کہیے
کاغذاتِ حرام زدگی ہیں!

تنویر پھولؔ

تشریف اور گوند

تُو تو بڑا شریف ہے، "تشریف" میں شریف
کرسی ہے اقتدار کی، "تشریف" اس پہ رکھ
ایسا لگا لے گوند کہ چپکی رہے سدا
تا عمر بادشاہی کے سارے مزے تو چکھ

تنویر پھولؔ

ذو معنوی فتوے

وضو کر کے جو پا دے مسجد میں
اپنے سارے گناہ دھوتا ہے!
لوگ حیراں ہوئے تو وہ بولے
"پا" کا مطلب تو "پیر" ہوتا ہے

تنویر پھولؔ

شیر کا پنجرہ

بن کے ڈاکو لیڈروں نے مل کے لوٹا قوم کو
بن گئے سنڈا اس کا لوٹا تو پھیلی خوب گند
بادشاہی اس نے کی اور خون بھی چوسا بہت
لوگ اب یہ چاہتے ہیں، شیر ہو پنجرے میں بند

تنویر پھولؔ

دوا کے بغیر ڈاکٹر اور مریض ایک دوسرے کے لئے بے مصرف ہوتے ہیں۔صرف دوائی ہی ان کے مابین رشتہ کو قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔اگرچہ دوا ہی وہ آخری ہتھیار ہے جس کے دم سے مریض شفا کی منزل پر پہنچنے کے قابل ہوتا ہے۔مگر صحت کی منڈی میں ہر قسم کی بیماری کے علاج کی خاطر اپنا اپنا مال بیچنے والوں نے غذا کی طرح اب تو دوا بھی نا قابل اعتبار بنادی ہے۔مریض اس بے یقینی کے عالم میں کہتا پھرتا ہے۔

دوا آبِ بقا ہے چشمہ ظلمات میں پنہاں
جنابِ خضر آئیں تو بہم پہنچائی جاتی ہے

نذیر احمد شیخ

آخرش مرض روگ بن جائے
اس سے پہلے کوئی دوا دیکھو

مخدوم علی ممتاز

دوا کے کیمیائی نام یعنی جینرک نیمز

ادویات عموماً دو ناموں سے پہچانی جاتی ہیں، خاندانی اور تجارتی نام بلکہ اکثر دوائیں تو اپنے خاندانی نام سے کم اور نک نیم nick name یعنی تجارتی نام سے زیادہ پہچانی جاتی ہیں۔بیچارہ سادہ لوح مریض مختلف ڈاکٹروں سے ایک ہی دوائی کے ڈھیر گھر میں سجالیتا ہے،اس ہجوم میں دوائی کئی بھیس بدل کر اس کے قریب موجود ہوتی ہے اور وہ اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔اس چھپن چھپائی کے پیچھے دوا کے کیمیائی نام یعنی جینرک نیمز اور اس کے تجارتی نام

کا فرق کارفرما ہے۔

سید محمد جعفری نے ۷۰ کی دہائی میں جینرک ناموں پر ایک نظم لکھی جب حکومت وقت نے فیصلہ کیا تھا کہ دواؤں کے تجارتی نام خارج کردیئے جائیں اور کیمیائی ناموں کو استعمال کیا جائے۔ اس نظم میں اگرچہ سید محمد جعفری نے دواؤں کے کیمیائی ناموں کا ڈاکٹری نسخے میں استعمال مریضوں اور معاشرے کے لئے خرابی کا باعث بتایا ہے۔ مگر بحیثیت ڈاکٹر مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس مسابقت کے اس دور میں دوا ساز اداروں اور لالچی ڈاکٹروں کی ملی بھگت غریب مریضوں کو جس طرح نقصان پہنچا رہی ہے اس کا مشاہدہ میں دوران پریکٹس بیس سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اُس دور میں اس کی کیا ضرورت تھی یہ فیصلہ کیوں کیا گیا تھا اور اس پہ عمل درآمد کیوں نہیں کیا گیا۔ اس بات کی تحقیق ایک الگ موضوع ہے۔ لیجیے اس سلسلے میں ذرا جعفری صاحب کی رائے ملاحظہ کیجیے:

جینرک نیمز نے مل جل کے کیا ہم کو تباہ
ہوگئی ہے ملک الموت سے اب یاد اللہ
لو نظر آنے لگی ملک عدم جانے کی راہ
موت برحق سہی کیا زندہ بھی رہنا ہے گناہ

اب دواؤں پہ نہیں بلکہ دعاؤں پہ جیو
ان شتر غمزوں پہ مرجاؤ اداؤں پہ جیو

قیمتیں فی صدی کم ہوگئی ہیں ڈھائی ہزار
یعنی صد روپیہ جو کردے گا دواؤں پہ نثار
دو صد اور ایک ہزار اس کو ملیں گے دو بار
حکم سرکار ہے تکرار ہے اس میں بے کار

وہ دوا دے گا جو اس دور کا قارون بھی ہے
بیچنے والے کا گھر بکنے کا قانون بھی ہے

دیکھو بیمار نہ ہونا نہیں مر جاؤ گے
چل کے سیدھے ہی تم اللہ کے گھر جاؤ گے
یوں تو سب رستے ادھر کے ہیں جدھر جاؤ گے
جینرک نیمز کا پر نام تو کر جاؤ گے

جینا مشکل ہے مگر مرنے میں آسانی ہے
حائل اے چارہ گرو میری گراں جانی ہے

گنڈے تعویذ کی دنیا کو جلال آیا ہے
علم و حکمت پہ مگر وقت زوال آیا ہے
اک مریض آج لئے ہڈی پہ کھال آیا ہے
پر دوا دینے کا اس کو جو سوال آیا ہے

ہے طبیب آدمی لکھی ہوئی روداد نہیں
جینرک نیمز دواؤں کے اسے یاد نہیں

اب علاج اس کا ہے جو ہومیو پیتھک ہوگا
پردہ آنکھوں پہ جو اس کی ہے، بہت تھک ہوگا
لب بیمار پہ نالہ کبھی جھک جھک ہوگا
یہ رہ ملک فنا کا کوئی سالک ہوگا

جو بھی پیدا ہوا اک دن تو اسے مرنا ہے
جینرک نیمز پہ الزام مگر دھرنا ہے

سید محمد جعفری

دوا اور مریض

بچپن میں انگریزی کے نصاب میں شامل ایک کہانی پڑھ کر میں بہت ہنستا تھا۔ جس میں ایک ڈاکٹر جب افریقہ کے دوردراز علاقوں میں مریضوں کو دوائی دیتے ہوئے بہت کچھ سمجھاتا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جاہل مریض چہرے پہ ملنے والی دوائی کھالیتے تھے اور لگانے والی دوائی پی لیتے تھے۔ ڈاکٹر بننے کے بعد عملی میدان میں قدم رکھ کر جب مملکت خداداد پاکستان میں میرا واسطہ اس طرح کے مریضوں سے پڑا تو مجھے اپنی اس ہنسی پر افسوس ہونے لگا۔

لاعلمی اور جہالت

فاخرہ تو پاگل تھی
فیشنوں کے چکر میں، یوں فریب کھا بیٹھی
رنگ گورا کرنے کی، ہر دوا منگا بیٹھی
تھی دوا جو کھانے کو، وہ دوا لگا بیٹھی
جو دوا لگانی تھی اس، دوا کو کھا بیٹھی
اور اس حماقت میں، اپنی جاں گنوا بیٹھی
فاخرہ تو پاگل تھی

سرفراز شاہد

مریض کا نکتۂ نظر

مریض کا دوا سے ہمیشہ ہی رقیبانہ تعلق رہا ہے۔ کبھی تو وہ دوا کی عدمِ دستیابی کا رونا روتا رہتا ہے اور کبھی دوا مل جائے تو اس سے حتیٰ الامکان بچنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ حرکتیں خواتین زیادہ کرتی نظر آتی ہیں

جو بیتی ہے مجھ پر وہ کیسے بتاؤں
کہ سوچا تھا کیا اور کیا ہوگیا
وہ نسخے دیئے ڈاکٹر نے مجھے
دواؤں میں میں مبتلا ہوگیا

انور مسعود

سواب بھی ہے

مریضِ دل کی بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
دواؤں کی خریداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
جسے دیکھو نیا نسخہ وہ ہم پر آزماتا ہے
طبیبوں کی وہ خونخواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
مرض کہنہ اگر ہوجائے تو پھر سب کی چاندی ہے
پرانی تجربہ کاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
طبیب و ڈاکٹر عطار و وید و ہومیوپیتھک
وہی سب کی دکاں داری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
دوائیں بھی گراں اور مشورہ اس سے گراں زیادہ
وسائل کی نگوں ساری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
دوائیں بڑھتی جاتی ہیں اگرچہ روز نسخے میں
مگر قائم وہ بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مریض کی فریاد

ہیلتھ کے شعبے میں گھس آئے مداری ہائے ہائے
لو عزیزو آئی اب شامت ہماری ہائے ہائے
جب بھی جاتا ہوں نیا اک ٹیسٹ کرواتے ہیں آپ
آزماتے ہیں دوائیں باری باری ہائے ہائے
ایک کے بعد اک نیا انجکشن دیتے ہیں آپ
حل مگر کرتے نہیں مشکل ہماری ہائے ہائے
مشورے کی فیس دے کر ہوگئے قلاش ہم
ہو اگر ممکن دوا دے دیں ادھاری ہائے ہائے
کیا کریں بیمار اب تو پھنس گئے ہیں جال میں
ڈاکٹر نقلی، دوائیں جعلی ساری ہائے ہائے
ٹیکہ جو مجھ کو لگایا پھول کر کپا ہوا
خوب کی ہائے مری تیمارداری ہائے ہائے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

میں جو آیا دامِ فریب میں، تو بچا نہ کچھ مری جیب میں
وہیں رہ گئی تھی دوا مری تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مجھے ٹیکے خوب لگاتے تھے، شب و روز پیسے بناتے تھے
ہوئی جیب خالی جو تھی بھری، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ناغہ کرنے سے دوا کی جو ہے منہ پر رونق
''وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے''

مرزا عاصی اختر

دوا اور ڈاکٹر

دوا کا نسخہ ہی دراصل ڈاکٹر صاحبان کا ہتھیار ہوتا ہے جس کی بدولت وہ مریض کا کامیابی سے شکار کرتے ہیں۔ اسپیشلسٹ حضرات تو شام کو ٹائیاں کس کر دوا ساز کمپنیوں کا کاروبار چمکانے پرائیویٹ پریکٹس کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں جب کہ

جنرل پریکٹیشنر اپنے مطب میں ادویات کی دکان سجا کر مریضوں کی چارہ گری کرتا ہے اور اپنے لئے چارے کا انتظام کرتے ہیں۔

کھانستا اور چھینکتا ہے جب بھی گلزارِ حیات
ڈاکٹر لے آتے ہیں فوراً ہی پیغامِ نجات
آج کل جوبن پہ ہے اُن کا چمن زارِ مطب
''اودی، اودی، نیلی، نیلی، پیلی، پیلی، ادویات''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

معالج ہمارے یہ کیا لکھ رہے ہیں
دواؤں کے بدلے دعا لکھ رہے ہیں

مرزا عاصی اختر

کہیں کھا تو نہ لیں میری دوائیں
مسیحا پڑ گئے بیمار میرے

امیر الاسلام ہاشمی

وہ دوا جو مارکیٹ میں نہ تھی
ڈاکٹر نے بیچ دی بلیک میں

سیّد فہیم الدین

دوائی کی اقسام

زندگانی کی حقیقت ہے یہی ، بولا مریض
میٹھا شربت پی کے ہنس ، ٹیکہ لگے تو رو لیو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ادویات لینے کے مختلف ذرائع ہیں۔ کھانے والی دوائیاں شربت، گولی کیپسول کی صورت میں ملتی ہیں اور ایمرجنیسی یا الٹیوں کی صورت میں جب مریض دوا نہ لے سکے تو انجکشنوں کا استعمال کرنا پڑ جاتا ہے۔

ایلوپیتھک ادویات

ٹیکہ

ٹیکہ اور ڈرپ نیم خواندہ ڈاکٹر کے لئے آبِ بقا اور اصلی سیریئیس مریض کے لئے آبِ حیات ہے ۔

نشہ ڈرپ کا ہے ایسا چڑھا دماغوں میں
کہ اس کے آگے بھلا جام کیا ، سبو کیا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

خان کہتا تھا یہ'' خوچہ ام کو مت آزار دے
گولی کھائے گی نہ بالکل صرف ٹیکہ مار دے''
ڈاکٹر خو گرم گولی نے کیا خانہ خراب
''مانڑا 'جی چاہے ہے تم کو آج گولی مار دے''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جب مطب میں ڈاکٹر کے آ گیا ٹیکہ لگا
کیا بتاؤں میں کہ مجھ کو ہر دفعہ ٹیکہ لگا
پاس ان کے کب تھا رودادِ مرض سننے کا وقت
میں ابھی مشکل سے بیٹھا تھا کہ ٹھا ٹیکہ لگا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دردِ دل ، دردِ جگر کیسے رفع ہوتا ہے
مجھ کو معلوم تو اپنا ہٹا لے ٹیکہ
اے حسیں نرس نہ کر چھلنی مرے بازو
میری خاطر ذرا ماتھے پہ سجا لے ٹیکہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تن میں پکڑ کے خون کسی کا لگا دیا
کیا آیا جی میں روگ ہی جی کا لگا دیا
کہلاتی تھی جو پیار محبت کی ڈاکٹر
ظالم نے مجھ کو ہجر کا ٹیکہ لگا دیا

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

جس سے احساس غم ہی مٹ جائے
کوئی ایسی دوا پلا دیجئے
کوئی ٹیکہ قرار و تسکین کا
آہ مجذوب کو لگا دیجئے

مجذوب چشتی

نوکِ مژہ جو دل میں چبھی دل تڑپ اٹھا
کچھ تو ہوا ہے ٹیکہ کرانے سے فائدہ

حاجی لق لق

گولی

مریض دفع مرض کے واسطے گولی کھاتا ہے جب کہ ڈاکٹر دوائی لکھتا بھی ہے اور اگر مریض اسے تنگ کرے تو اس کو گولی بھی کراتا ہے اور یوں دو طرح سے گولی دیتا ہے۔ جب کہ ڈاکو کی گولی سب سے خطرناک ہوتی ہے۔ شاعروں نے گولی کا استعمال کن طریقوں سے کیا ہے ان کی مثالیں ملاحظہ کیجئے

جس بورڈ پہ لکھا شافی ہے
بس ایک ہی گولی کافی ہے

امیر الاسلام ہاشمی

ڈاکٹر اور ڈاکوؤں کے فرق کو
ایک سچی داستاں ہے کیا بتاؤں کیا ہوا
ڈاکوؤں کی گولیاں کھا کر تو بچ نکلا تھا وہ
ڈاکٹر کی گولیاں کھا کر بچارہ چل بسا

انعام الحق جاوید

وہ جو پستول سے نکلتی ہے
صرف گولی ہے وہ اثر والی

سرفراز شاہد

شربت

اکثر مریضوں کا خیال یہ ہے کہ کیپسول گرم ہوتے ہیں جب کہ شربت کی صورت میں دوائی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ لہذا ہم نے دوران پریکٹس بڑی عمر کے لوگوں کو با اصرار شربت لکھواتے دیکھا۔

راجہ جی آئے کلینک میں یہی کہتے ہوئے
''بھاپا می کی'' کوئی شربت آج ٹھنڈا ٹھار دے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دیکھی جو میری نبض تو کچھ لمحہ سوچ کر
کاغذ لیا اور عشق کا بیمار لکھ دیا
قربان کیوں نہ جاؤں میں ایسے طبیب پر
نسخے میں جس نے شربتِ دیدار لکھ دیا

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

سیمپل کی دوا

میڈیکل کمپنیاں دوا کی مشہوری کے لئے سیمپل کی دوائی ڈاکٹروں کو فراہم کرتی ہیں تا کہ ڈاکٹر انہیں استعمال کرا کر اپنی تسلی

کرلیں اور دوا کی اثر پزیری سے مطمئن ہو کر انہیں مریضوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال کروائیں۔ مفت دوائی ملنے کی لالچ کے علاوہ کچھ لوگوں کا یہ بھی نظریہ ہے کہ کمپنی کی سیمپل کی دوائی بالکل صحیح اور اثر اندازی میں بہترین ہوتی ہے کیونکہ یہ نمونے کے دوا ہوتی ہے اور اگر یہ اثر نہ کرے تو ڈاکٹر اسے کیوں لکھے گا اس لئے لوگ سیمپل کی دوائی بڑی خوشی سے لے کر استعمال کرتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ

سیمپل بھی بیچتے ہیں بر سرِ بازار آپ
ختم ہے بس آپ پر ایمانداری ہائے ہائے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اسٹیراوئیڈز

یہ ادویات ایک خاص کیمیائی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا استعمال صحیح ہاتھوں میں باعث شفا ہے جب کہ غلط ہاتھوں میں یہی دوا زہر بن جاتی ہے۔ مریضوں کو جلد آرام دلانے کی خاطر نیم حکیم یہ دوائیاں بہت استعمال کرتے ہیں ۔

موٹا کرنا ہو تو ڈیکسا گھول کر دے دیجئے
سانس چڑھتا ہو تو ڈیکسا گھول کر دے دیجئے
درد زیاد ہو تو ڈیکسا گھول کر دے دیجئے
کچھ نہ آتا ہو تو ڈیکسا گھول کر دے دیجئے
جرم یہ ایسا ہے کوئی جیل جا سکتا نہیں
"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شفا اگر ہے کہیں تو ہے صرف ڈیکسا میں
حکیم ، ہومیو ، نباض اور گرو کیا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

وٹامن اور ٹانک

مریضوں میں عموماً یہ خیال عام ہے کہ ٹانک اور وٹامن جسم کو بہت زیاد طاقت بخشتے ہیں۔ یہ بات درست ہے مگر صرف وہاں جہاں ان کی ضرورت ہو۔ متوازن غذا وٹامن اور ٹانک سے کہیں بہتر ہے۔ بلا وجہ کے وٹامن صحت کے لئے نقصان کا باعث بھی ہو سکتے ہیں ۔ یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک

سرکاری ہسپتال کے شعبہء بیرونی مریضاں میں ایک بزرگ خاتون ڈاکٹر سے اصرار کر رہی تھیں کہ مجھے کوئی طاقت کی دوائی لکھ دیں۔ ڈاکٹر صاحب جو مریضہ کا مکمل معائنہ کر چکے تھے کہنے لگے کہ اماں جی ماشاللہ آپ بالکل صحت مند ہیں۔ آپ کو کسی ٹانک کی ضرورت نہیں مریضہ پھر اصرار کرنے لگی اور بولی نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے طاقت کی دوا ضرور لکھ کر دیں کیونکہ گھر میں بہو آگئی ہے اور اب اکثر اس سے لڑائی ہو جاتی ہے ۔

پیتا رہا ہوں مدتوں ٹانک کی شیشیاں
کچھ کچھ لگا ہوں اب غمِ دوراں سہارنے

عطاالرحمٰن ہاشمی

وہ زہر میں ڈال کر وٹامن بھی دے رہا ہے
تو اس سے ظاہر ہے اس کی نفرت میں پیار آدھا

اطہر شاہ خان

وٹامن دو گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں ، پانی میں حل پزیر اور چکنائی میں حل پزیر۔ پانی میں حل پزیر وٹامن اگر ضرورت سے زیادہ ہوں تو جسم سے قارورہ کی صورت میں نکل جاتے ہیں ۔ ہندوستان کے وزیر اعظم مورارجی ڈیسائی اس ذریعے سے وٹامن حاصل کرنے میں بہت مشہور ہوئے تھے جس پر ہندوستان کے مزاحیہ شاعر جوہر سیوانی کا قطعہ ملاحظہ فرمائیں

مریضو! غور سے سن لو یہ نسخہ
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
ابھی کچھ اور بھی تحقیق ہوگی
یہی تحقیق کی منزل نہیں ہے
وٹامن جسم کے فضلات میں بھی
نکل آنا کوئی مشکل نہیں ہے

جوہر سیوانی

انٹی بائیوٹک

جراثیم کش ادویات ایلوپیتھک ادویہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کی حامل ہیں مگر ان کے غلط استعمال کی وجہ سے آج بہت

ساری جان بچانے والی ادویات بیکار ہوکر رہ گئی ہیں۔ایک طرف ان ادویہ کا بے تحاشا غلط استعمال ہے جو عموماً غریب اور متوسط طبقے کے مریض نیم حکیموں سے مجبوراً اور کبھی جاہل مریض جو بزعم خود بہت عقلمند بنے پھرتے ہیں جان بوجھ کر استعمال کرتے ہیں۔مگر اسی معاشرے میں کچھ پڑھے لکھے مریض صاحبان ایسے بھی ہیں جو ضرورت ہونے کے باوجود اینٹی بائیوٹک دوائی کے استعمال کو گناہ سمجھتے ہیں۔

اینٹی بائیوٹک کی پوٹینسی بہت ہائی نہ ہو
لیڈی کہتی تھی کوئی ہلکی دوا اس بار دے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نیند کی دوا

خواب آور دوا کی کرامت ہے یہ
نیند سے پھر تازہ سا چلنے لگا

نعیم نیازی

نیند کی گولی بھی دی پھر بھی افاقہ نہ ہوا
ایک پل لگ نہ سکی عاشقِ بیمار کی آنکھ

وکیل اظہر فاروقی

گولیاں ''ویلیم'' کی دس کھالیں
''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

درد کی دوا

کارگر ''سیریڈون'' ہوتی نہیں
''آخر اس درد کی دوا کیا ہے''

جوہر سیوانی

حکیمی ادویات

حکیموں کی ادویات میں کشتے اور اس کی خاصیت میں گرمی کا بڑا تذکرہ ملتا ہے۔انور مسعود اور مظہر عباس کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے لکھتے ہیں

کشتوں کے پشتے

اگر ہیں تیغ میں جوہر جواہر میں خمیرے ہیں

ادھر زور آزمائی ہے ادھر طاقت کے نسخے ہیں
مطب میں اور میدان وغا میں فرق اتنا ہے
وہاں کشتوں کے پشتے ہیں یہاں پشتوں کے کشتے ہیں

انور مسعود

کشتہ کُشتی

اپنی صحت سے کریں کُشتی نہ کیوں وہ آج کل
کھا رہے ہیں کُشتہء صحت فزائے بے بدل
معدہ پُر تبخیر ہے ، گُردے ہوئے دونوں خراب
لگ گئے کُشتوں کے پُشتے اب تو کچھ مظہر سنبھل

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اشتہاری حکیم

کراچی سے پشاور تک سفر میں
نوشتہ بر سرِ دیوار پڑھنا
ہو فیملی ساتھ تو ہوتا ہے مُشکل
حکیموں کے سب '' اشتہار'' پڑھنا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اثرات کُشتہ

کھا کر حکیمی معجون و کُشتہ
بوڑھے ہوئے ہیں اب پھر سے چُستہ
لیکن نہ سمجھے وہ بھی یہ نکتہ
گُردوں کے ان کے بنتا تھا بھُرتہ
ہیں فیل گُردے اور وہ بچارے

جیتے ہیں بس "ڈائی۔لسس" کے سہارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گرمی

ہوئی جسم کے آشیانے میں گرمی
حکیموں نے بھر دی زمانے میں گرمی
مزاجوں میں کیونکر نہ ہو اتنی حدت
جگر میں ہے گرمی، مثانے میں گرمی
جو نسخے حکیمی چلے شہر بھر میں
ہوئی پھر ہر اک بالا خانے میں گرمی
بتائیں حکیم اب غذا کھاؤں کیا میں
فلاں سرد ہے تو فلانے میں گرمی
نکلتے ہیں گرمی میں دانے کہ مظہر
فقط ہوتی ہے گرمی دانے میں گرمی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

غذا سے علاج

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہیں تک چاہئے بچنا دوا سے
اگر خوں کم ہے اور بلغم زیادہ
تو کھا گاجر، چنے شلغم زیادہ
اگر ہوتی ہو معدے میں گرانی
تو پی لے سونف اور ادرک کا پانی
تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے
جو دکھتا ہو گلہ نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے
جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس
تو مصری کی ڈلی ملتان کی چوس
تپ دق سے اگر چاہے رہائی
بدل پانی کے گنا چوس بھائی

اگر تجھ کو لگے جاڑے میں سردی
تو استعمال کر انڈے کی زردی
شفا چاہے اگر کھانسی سے جلدی
تو پی لے دودھ میں تھوڑی سی ہلدی
جو بدہضمی سے تو چاہے افاقہ
تو دو اک وقت کا کر لے تو فاقہ

اسد ملتانی

گلہائے تبسم میں انعام الحق جاوید صاحب نے اگرچہ اسے حکیم یونانی کے نام سے موسوم کیا ہے مگر ہم نے اسے کہیں جناب اسد ملتانی کے نام سے بھی پڑھا ہے۔ محققین حضرات اس بارے میں حتمی رائے دے سکیں گے۔

ھومیوپیتھک ادویات

میٹھی میٹھی گولی کھا
منہ میٹھا کر، دل بہلا
عارضہ لمبا ہے تیرا
فیس ہماری بھرتا جا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ایکشن سے زیادہ ڈرتے ہیں ری۔ایکشن سے ہم
کی ہے دوا اسی لئے تیری سلیکٹ بھی
سائیڈ ایفیکٹ کوئی نہیں اس دوا کے پر
اتنا بتا کہ ہے کوئی اس کا ایفیکٹ بھی؟

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

انگریزی ادویات

دادا بڑے بھولے تھے سب سے یہی کہتے تھے
کچھ زہر بھی ہوتا ہے انگریزی دواؤں میں

بشیر بدر

ہیں بہاریں بہت کم خزائیں بہت
گرم ہیں ڈاکٹر کی دوائیں بہت
آگ لگتی ہے سینے میں کھا کر انہیں
ہو چکی اب مری جاں جفائیں بہت
کوئی ٹھنڈی دوا تم حکیموں کی لو
مشورہ مفت لو مشورہ مفت لو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گرم ہو یا سرد ہو یا معتدل آب و ہوا
بس یہ انگریزی دوا انگار ہے میرے لئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

عملیات و جھاڑ پھونک

قولِ عامل

مرے قبضے میں ہیں جنات، ہر مشکل کا حل میں ہوں
پلٹ سکتا ہوں تیری زندگی میں چاہوں جس دَم بھی
کہا عامل نے، ''ہیں اقبال بھی اس بات کے قائل
''عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

رومانی کلینک

ہے قسمت میں ہمارے نارسائی کیا کریں مظہرؔ
رگڑتے ہیں اگرچہ ہم بہت اپنی جبینوں کو
یہ روحانی کلینک ہے کہ رومانی کلینک ہے
ہمارے پیر جی دیکھیں یہاں بس نازنینوں کو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پھونکوں سے علاج

تعویذ ٹونے ٹوٹکے آتے نہیں سمجھ
ہم سے تو یہ علاج کرایا نہ جائے گا
ہے حرکتوں پہ پیر تری خندہ زن اجل
''پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مریضوں کی آرزو

بس ایک ٹیکے سے سب درد ہوں رفع ان کے
سوائے اس کے مریضوں کی آرزو کیا ہے
افاقہ ہوگا انہیں جھاڑ پھونک سے مظہرؔ
یہاں دوائی کی حکمت کی آبرو کیا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دوائیں ہسپتال کی

ہسپتالوں میں دواؤں کی عدم ستیابی ہمیشہ سے ایک عوامی موضوع رہا ہے۔ مزاحیہ شعرا نے بھی اس میں اپنا خاطر خواہ حصہ ڈالا ہے اور اس سلسلے میں صرف سرکاری ہی نہیں بلکہ پرائیویٹ ہسپتالوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے

سرکاری ہسپتال

ہسپتالوں میں تو کثرت سے ہے موجود مگر
مفت ملتی ہے مریضوں کو دوائی کتنی

غفار بابر

اسپتالوں سے دوائیں سب چرا کر لے گیا
جو امیرِ انتظامِ شعبۂ بہبود ہے

خالد عرفان

سرنج ہے نہ دوا ہے مریض غم کے لئے
تو کیا کرے گا بھلا آ کے ڈاکٹر تنہا

وکیل اظہر فاروقی

جب دوائیں تھیں نہ تھا موجود کوئی ڈاکٹر
اب دوائیں غیر حاضر ڈاکٹر موجود ہے

نیاز سواتی

کس سے گلہ کروں میں مقدر کی بات ہے
فصلِ بہار میں کلی دل کی نہ کھل سکی
جب بھی علاج کے لئے پہنچا میں ہسپتال
گر ڈاکٹر ملا تو دوائی نہ مل سکی

مجذوب چشتی

مریضوں کو دے کر تسلی وہ بولے
حکومت نے بھیجی دوا بس یہی ہے

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

مریضوں سے معالج کہہ رہے ہیں
ہمارے پاس کب اتنی دوائیں
یہاں اسٹور سب خالی پڑے ہیں
انھیں جائیں دوا باہر سے لائیں

انور مسعود

ہوئی جستجوئے درماں بنیں ٹھوکریں مقدر
نہ میں ہسپتال جاتا نہ یہ حالِ زار ہوتا
یہ دوائی ہسپتالی کہ ہے آدھی شیشی خالی
نہ میں اِس کو گھر میں لاتا ، نہ میں شرمسار ہوتا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

درد کے مریضوں کو ہسپتال میں مظہرؔ
اِک دوائی کی خاطر خوب دوڑایا
ایک درد کی گولی ہسپتال سے لے کر
''درد کی دوا پائی ، دردِ لادوا پایا''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پرائیوٹ ہسپتال

پیمنٹ ہسپتال کی ہوگی نہ جب تلک
مرتا ہوا مریض بچایا نہ جائے گا

خالد عرفان

دوائیں بھی کھلا دو ایک دو معجون بھی دے دو
ذرا دیکھیں یہ ہم بھی اب ری ایکشن کون کرتا ہے

سیّد فہیم الدین

مہنگی ادویات

میڈیسن کی قیمتیں سن کر تو چڑھتا ہے بخار
اب اطبا کی دوا پیتا ہوں اور کھاتا ہوں میں

ہدایت علی ناظر ٹونکی

دل کی بیماری کی انگریزی دوا مہنگی ہے
سب سے آسان دوا موت ہی ارزاں ہے ابھی

جوہر سیوانی

کچھ تو مر مر کے یہاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دوا
اور مر جاتے ہیں کچھ لوگ دوا سے پہلے

وکیل اظہر فاروقی

غریبوں کا مرض جائے تو کیسے
بڑی مہنگی دوائی ہو رہی ہے

سجاد مرزا

بی کی جگہ وائٹامن سی کا لگا دیا
تو نے تو مجھ کو روگ ہی جی کا لگا دیا
تو ڈاکٹر ہے یا کسی ڈاکو کا بھائی ہے
مجھ کو بھی ایک لاکھ کا ٹیکہ لگا دیا

انعام الحق جاوید

جعلی دوا

قصد ان مہلک دواؤں کا نہیں رفعِ مرض
مدعا یہ ہے کہ پھیلے اور اس دنیا کا روگ

کیمیا سازانِ مغرب کا یہ مقصد ہے فگارؔ
دوسری دنیا میں جائیں تیسری دنیا کے لوگ

دلاور فگار

کل یہ بات کہتا تھا اک مریض دوجے سے
ہسپتال آکر بھی سوچتا ہوں کیا پایا
کس قدر ملاوٹ ہے ادویات میں بھائی
"درد کی دوا پائی درد لادوا پایا"

انور مسعود

کیپسولوں میں کچھ اثر ہی نہیں
جانے ان میں بھرا ہوا کیا ہے

نیاز سواتی

ڈبل خوراک بھی کھاؤں اثر پھر بھی نہیں ہوتا
نہ جانے آجکل ہوتا ہے کیا شامل دوائی میں

نیاز سواتی

یقیں ہو کیسے ہر اک چیز میں ملاوٹ ہے
کہ اب تو نقلی بھی اصلی دوا لگے ہے مجھے

جوہر سیوانی

تندور کی جلی ہوئی روٹی اسے کھلا
روٹی کھلا کے حقے کا پانی اسے پلا
جعلی دوا بناتا ہے جوتے اسے نہ مار
جوتے کی آبرو کو نہ یوں خاک میں ملا

طٰہٰ خان

غلط نسخے

غلط نسخوں میں اکثر ڈاکٹروں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور یہ ڈاکٹروں کی عجلت، وقت کی قلت، مریضوں کی کثرت، اور ڈاکٹر کی ماری گئی مت غرض کسی بھی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی جگہ قصوروار مگر کبھی کبھار مریض بھی اپنی نادانی، دواؤں کی گرانی، اور ڈاکٹر کی نافرمانی کے سبب صحیح نسخوں کے غلط استعمال سے اپنے آپ کو ناقابل معافی نقصان پہنچا دیتا ہے ۔ اکثر مریض ڈاکٹر کی مرضی کی دوا لکھواتے ہیں مگر اسے اپنی مرضی سے کھاتے ہیں۔

حکیمی دوا، ہومیوپیتھک، اور ایلوپیتھک جو مل جائے مدعا صرف یہ
ہے کہ آرام آنا چاہئے تکلیف فوری رفع ہونی چاہئے
ہو مرض کا خاتمہ فی الفور، دے ایسی دوا
ایسی تیسی بعد میں گر ہو جگر کی، خیر ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تھا مرض کچھ مگر دوا کچھ اور
اسلئے درد بڑھ گیا کچھ اور

نیاز سواتی

مرے مرض میں اضافہ ہی کرتی جاتی ہے
معالجوں نے مجھے دیں دوائیاں کیسی

نیاز سواتی

مجھے دے رہا ہے جو تو دوا
مجھے اس سے کیسے شفا ملے
کہ مرا مرض کوئی اور ہے
کہ مری دوا کوئی اور ہے

نیاز سواتی

یار کی فرقت میں پیلے ہوگئے
ڈاکٹر نے دی دوا یرقان کی

شبنم کارواری

آبدیدہ خوں چکیدہ تھا فراقِ یار میں
ڈھل گئی تھی آنسوؤں میں ایک عاشق کی صدا
عشقِ پُر آشوب میں تھا مبتلا لیکن اسے
ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دے دی آنکھوں کی دوا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اوپردرج قطعات اپنی جگہ خوبصورت ہیں مگر جو دوامی شہرت انور مسعود کی نظم سائیڈ ایفیکٹ کو نصیب ہوئی ہے اس کی مثال نہیں۔ایک نشست میں مجھ سے کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب میں نے یہ نظم پیراسٹامول کے طبی لٹریچر کو پڑھ کر لکھی ہے۔

سائیڈ ایفیکٹ

سر درد میں یہ گولی بہت زود اثر ہے
پر تھوڑا سا نقصان بھی ہوسکتا ہے اس سے
ہو سکتی ہے پیدا کوئی تبخیر کی صورت
دل تنگ و پریشان بھی ہوسکتا ہے اس سے
ہوسکتی ہے کچھ ثقلِ سماعت کی شکایت
بیکار کوئی کان بھی ہوسکتا ہے اس سے
ممکن ہے خرابی کوئی ہوجائے جگر میں
ہاں آپ کو یرقان بھی ہوسکتا ہے اس سے
پڑ سکتی ہے کچھ جلد خراشی کی ضرورت
خارش کا کچھ امکان بھی ہوسکتا ہے اس سے
ہوسکتی ہیں یادیں بھی ذرا سی متاثر
معمولی سا نسیان بھی ہوسکتا ہے اس سے
بینائی کے حق میں بھی یہ گولی نہیں اچھی
دیدہ کوئی حیران بھی ہوسکتا ہے اس سے
ہوسکتا ہے لاحق کوئی پیچیدہ مرض بھی
گردہ کوئی ویران بھی ہوسکتا ہے اس سے
ممکن ہے کہ ہوجائے نشہ اس سے زیادہ
پھر آپ کا چالان بھی ہوسکتا ہے اس سے

انور مسعود

ایک نسخہ ہزار ادویات

اہل دانش کو علم کا اعزاز
نسخہ ہائے وفا پہ ملتا ہے
دور جمہور میں طبیبوں کو
نسخہ ہائے دوا پہ ملتا ہے

ضیاالحق قاسمی

دوائیوں کے مضر اثرات

اثر اس پر نرالا ہوگیا ہے
دوا سے اور کالا ہوگیا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ری ایکشن

بولا اِک مُردہ کہ اب لُطفِ قضا جاتا رہا
وہ سسک کر جان دینے کا مزہ جاتا رہا
موت دے دی اِک غلط ٹیکے سے پل بھر میں ہمیں
اور اِس ''ایکشن'' کو''ری ایکشن'' کہا جاتا رہا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ہم نے تو دردِ سر میں یہ دیکھی دوا کی شان
ہلکا ہوا جو درد تو بازو اکڑ گئے
جب بازوؤں کی سخت روی کا کیا علاج
سر پر جو ہاتھ پھیرا تو سب بال جھڑ گئے

طٰہٰ خان

کوئی خالی نہیں سوء اثر سے
یہ ہم کیسی بلائیں کھا رہے ہیں
دوائیں ہم کو کھاتی جارہی ہیں
کہ انور ہم دوائیں کھا رہے ہیں

انور مسعود

طبی مشورہ

اک ڈاکٹر سے مشورہ لینے کو میں گیا
ناسازی مزاج کی کچھ ابتدا کے بعد
کرنے لگے وہ پھر مرا طبی معائنہ
اک وقفۂ خموشیِ صبر آزما کے بعد
ضرباتِ قلب و نبض کا جب کر چکے شمار
بولے وہ اپنے پیڈ پہ کچھ لکھ لکھا کے بعد
ہے آپ کو جو عارضہ وہ عارضی نہیں
سمجھا ہوں میں تفکرِ بے انتہا کے بعد
لکھا ہے ایک نسخۂ اکسیر و بے بدل
دربارِ ایزدی میں شفا کی دعا کے بعد
لیجئے نمازِ فجر سے پہلے یہ کیپسول
کھائیں یہ گولیاں بھی نمازِ عشا کے بعد
سیرپ کی ایک ڈوز بھی لیجئے نہار منہ
پھر ٹیبلٹ یہ کھایئے پہلی غذا کے بعد
لینی ہے آپ کو یہ دوا اِس دوا سے قبل
کھانی ہے آپ کو یہ دوا اس دوا کے بعد
ان سے خلل پذیر اگر ہو نظامِ ہضم
پھر مکسچر یہ پیجئے اس ابتلاء کے بعد
لازم ہے پھر جناب یہ انجکشنوں کا کورس
اُٹھیں نہ ہات آپ کے گر اس دوا کے بعد
تجویز کردیئے ہیں وٹامن بھی چند ایک
یہ بھی ضرور لیجئے ان ادویہ کے بعد
پھر چند روز کھائیں یہ ننھی سی ٹیبلیٹ
کھجلی اٹھے بدن میں اگر اس دوا کے بعد
چھ ماہ تک دوائیں مسلسل یہ کھایئے
پھر یاد کیجئے گا حصولِ شفا کے بعد
اک وہم تھا کہ دل میں مرے رینگنے لگا
ان کے بیان نسخۂ صحت فزا کے بعد
کیمسٹ کی دکان بنے گا مرا شکم
ترسیلِ ادویات کی اس انتہا کے بعد
میں نے کہا کہ آپ مجھے پھر ملیں گے کب
روزِ جزا سے قبل کہ روزِ جزا کے بعد

انور مسعود

ڈاکٹر کی لکھائی

لگتا ہے کہ لکھے موسیٰ پڑھے خدا کا محاورہ ڈاکٹر حضرات کی لکھائی کے بارے میں ہی ایجاد کیا گیا تھا۔ سنا ہے کہ جب کسی بد

خط کی تحریر پڑھی نہیں جاسکتی تو سب سے پہلے کسی ڈاکٹر ہی کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ کیمسٹ بھی ڈاکٹر صاحب کی لکھائی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

نسخہ

ڈاکٹری نسخہ ہے یا تعویذ ہے یہ پیر کا
''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا''
ڈاکٹر سمجھے یا پھر کیمسٹ ہی سمجھے اسے
''کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا''
جس سے پوچھو نام لیتا ہے دوائی کا نیا
پڑھنا مشکل ہوگیا ہے کاتبِ تقدیر کا
دل پریشاں، عقل حیراں، کیا دوا دارو کریں
پوچھتے پھرتے ہیں مطلب سب سے اس تحریر کا
نسخہ پڑھنے کی الگ سے فیس لی کیمسٹ نے
بولا، پڑھنا ہے اسے لانا ہے جوئے شیر کا
جتنا سلجھایا اسے اتنا الجھتا ہی گیا
ہوگیا تھا یہ بھی قضیہ وادی کشمیر کا
تھی دواؤں میں نہیں نسبت بھی کوئی دور کی
ایک مصرع داغؔ کا تھا، ایک مصرع میرؔ کا

ڈاکٹر کا تھا، کہ تھا کیمسٹ کا اس میں کمال
آنکھ میں سوزش تھی نسخہ مل گیا تجنیر کا

ڈاکٹرمظہرعباس رضوی

دوابیچنے والے

میڈیکل سیلز مین

لذتِ کام و دہن کا کر رہا ہے اہتمام
لا رہا ہے سیلز افسر روز پیغامِ طعام
ہاؤس افسر اور پروفیسر سبھی اِس کے اسیر
چند چیزوں کے عوض کرتے ہیں سب اِس کو سلام
ہر کوئی گاڑے ہوئے ہے بیگ پر اس کے نظر
منتظر سب ہیں کہ دیکھیں آج کیا ہے اہتمام
مفت میں تحفے نہیں دیتا ہے ہرگز سیلز ریپ
مُدعا یہ ہے لکھے اس کی دوا ہر خاص و عام
عرض کرتا ہے مریضوں کی بقا کے واسطے
صرف میری ہی دوا لکھیئے خدا کے واسطے
ہے یہ کم قیمت ضرر سے پاک بے حد پر اثر
اس کا ثانی ہی نہیں کوئی اس ارضِ پاک پر
اچھی پیکنگ، عمدہ اِس کا ذائقہ، فوری عمل
اس کا مِل سکتا نہیں ہے کوئی بھی نعم البدل
گولیاں کیپسول انجکشن سرپ ہر روپ میں
کھانا چاہیں تو اسے بیشک ملائیں سوپ میں
یہ دوا آئی ہے بن کر دیکھئے جاپان سے
اک دفعہ کھالیں نہ چھوڑیں گے کبھی ایمان سے
بڑھ گئی مدِ مقابل سے دوائی، دیکھئے
دو منٹ پہلے یہ حل ہوتی ہے بھائی، دیکھئے
'پیک لیول' اُس سے جلدی اِک منٹ میں آئے گا
فرق پورے ساٹھ سیکنڈ کا ہے، کم مت جاننا
اُس سے بہتر ہر طرح سے اُس سے ہے اچھا اثر
بیس سیکنڈ اُس دوا سے ہے فزوں اِس کا اثر
فرق چھوٹے چھوٹے سارے کھینچ کر پھیلائے گا
سیلز افسر آپ کو ہر بات میں اُلجھائے گا
اب پڑھاتا ہے دوائیں ڈاکٹر کو سیلز ریپ
بن گیا ہے اُس کا بھی استاد دیکھو سیلز ریپ
وہ جو مظہر بیچتا ہے بس میں گا گا کر دوا

مختلف اس سے نہیں یہ سیلز افسر بھی ذرا
فرق اتنا ہے کہ اُس کے ہیں مخاطب ڈاکٹر
دوسرے کا ٹارگٹ ہیں بس میں اس کے ہم سفر
سیلز افسر جوہرِ تقریر یوں دکھلائے ہے
خوبیاں اپنی دوا کی بارہا جتلائے ہے
وہ جو بس میں بیچتا پھرتا ہے سب کو ادویات
وہ بھی ہر معجون کی گنواتا ہے عمدہ صفات
لِسٹ اس کو حفظ ہے اپنے مریضوں کی تمام
جس پہ اُس نے آزمائی ہے دوائے نیک نام
بھائی نتھو، خیر دینا، مولوی بسمل، سبھی
اُس کی پھکّی کھا کے دیتے ہیں دعائیں آج بھی
''سیمپل'' دیتا ہے سب کو سیلز آفیسر فری
ایک چٹکی پھکّی والا بھی کھلاتا ہے یونہی
بیچتے ہیں گو دوا دونوں الگ انداز میں
گونجتا ہے ایک ہی نغمہ پر اُن کے ساز میں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فارمیسی

دیکھیے گر فارمیسی میں پڑے سامان کو
ہوش اُڑ جائیں ہوا کیا حضرتِ انسان کو
پورا کرتے ہیں مطب میں اس طرح نقصان کو
بھینس کے انجیکشن ہیں درد کے درمان کو
کوئی بھی پابندیاں اِن پہ لگا سکتا نہیں
''آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کیمسٹ

کون ہے ان کو جو چیلنج کرے
جس کو جو چاہے دوا بیچتے ہیں
میر صاحب ہی سے پوچھے کوئی
''لونڈے عطار کے کیا بیچتے ہیں''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آخری بات

آپ ڈاکٹروں اور ان کے تجویز کردہ نسخوں ،ادویات کی گرانی اور نایابی، علاج میں مبینہ غفلت، غرض اس جیسے ہزاروں مضامین پر جتنی چاہے سیر حاصل بحث کر لیجیے ، ہر صورت میں ہمارے سرمایہ داری ماحول میں نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے کہ جسمانی بیماریوں کے علاج سے کہیں زیادہ ضروری معاشی علاج ہے:

اصل بیماری

طبی مرکز بھلا کریں گے کیا
مسئلہ یہ معاشیات کا ہے
ہے غریبی ہی اصل بیماری
کام کیا اس میں ادویات کا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ ان کے طنز و مزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ و شگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین ساتھیوں میں شامل ہیں۔

ارمانؔ یوسف

باب ہشتم

لندن ایکسپریس

لندن قدیم اور جدید تہذیبوں کا مرکز، برطانیہ کا دارالحکومت اور یورپ کا سب سے زیادہ گنجان آباد شہر ہے۔ شہر کی بنیاد دو ہزار سال قبل رومیوں کے زمانے میں رکھی گئی اور اس دور کی تعمیر کی گئی دیوار آج بھی موجود ہے۔ شہر کی آبادی اسی لاکھ سے زائد ہے جس میں گورے اکثریت کے ساتھ ہیں جبکہ ایشائی آباد کار بھی کل آبادی کا اٹھارہ فیصد ہونے کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

لندن نے جہاں بھر میں سیاست، سیاحت، صنعتی انقلاب، تعلیمی، تفریحی اور صحافتی رنگ اور اثر چھوڑا ہے۔

اب تو مشرق مغرب اور شمال جنوب میں پھیلے سارے شہر کو لندن ہی کہتے ہیں مگر لندن، سٹی آف ویسٹ منسٹر اور دی سٹی آف لندن میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے، یہ شہر کے اندر شہر، ملک کے اندر ملک اور ریاست کے اندر ریاست ہے جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ''دی سٹی آف لندن'' نامی اصل شہر کی لمبائی ایک مربع میل ہی ہے جس میں کوئی گلی بھی نہیں۔ یوں اگر کسی روز نیلام گھر میں آپ کی موجودگی میں یہ سوال پوچھا جائے کہ دنیا میں وہ کون سا شہر ہے جس میں کوئی پتلی گلی بھی نہیں تو آپ شہادت کی انگلی کھڑی کرنے کی بجائے سالم کھڑے ہو کر پورے اطمینان کے ساتھ باآوازِ بلند ''سٹی آف لندن'' کا نعرہ لگا سکتے ہیں اور جواب میں طارق عزیز صاحب ہوا میں مکا لہراتے ہوئے مخصوص انداز میں کہیں گے ''بجلی کا کھمبا آپ کا ہوا۔''

خیر ہم علی الصبح ملک اشفاق سے ناشتہ کر کے لندن دیکھنے چل نکلے۔ ٹوٹنگ براڈوے سے نادرن لائن ٹرین پکڑنی تھی۔ یہاں لندن میں ہر ٹرین سٹیشن، بس سٹاپ اور دیگر اہم مقامات پر اخبار سٹینڈ میں اخبارات رکھے ہوتے ہیں، آنے والا ہر مسافر تیز قدموں سے چلتا اخبار اٹھا کر یہ جا وہ جا۔ ہمیں بھی اخبار پڑھنے کا شوق چرایا۔ سوچا معلوم نہیں کتنے کا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اخبار اٹھاتے ہی جیب میں موجود پرس سے اخبار کی قیمت خود ہی نکل کر اخبار والوں کے اکاؤنٹ میں چلی جاتی ہو۔ بھئی ڈیجیٹل زمانہ ہے اور گوروں سے تو کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے۔ سو ہم نے ایک اخبار اٹھایا۔ کونے میں جا کر چند صفحے الٹے اور پھر جیب میں موجود پیسوں کو گنا جو ابھی تک بالکل سلامت تھے۔ یہی بابرکت حرکت ایک دو بار پھر دہرائی اور آخر میں احتیاطاً کسی سے پوچھ بھی لیا۔ مفت اخبار کی تصدیق پر ہم خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ کتنے ہی پاکستانی دوستوں کے چہرے نظروں میں گھوم گئے کہ آج وہ یہاں ہوتے تو ان کو اخبار مہیا کر کے احسان جتاتے ہوئے کہتے ''پڑھا

کروبار، جنرل نالج میں اضافہ ہوتا ہے۔‘‘

ٹوٹنگ براڈوے سٹیشن سے ہی ہم آٹھ پاؤنڈ کا ایک ایسا جادوئی ٹکٹ خریدا، جو پورے لندن میں سارا دن کام دے سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بسوں پر بھی وہی ٹکٹ چلتا ہے۔ اب تو ہر بس سٹاپ پر مسافروں کو انتظار کی اذیت سے بچانے کے لیے سٹاپ کے کونے پر لگی سکرین پر بس نمبر اور آنے کا وقت دکھایا جا رہا ہوتا ہے۔ زیادہ تر بسیں ڈبل کیبن یا ڈبل ڈیکر ہی ہیں۔ سنا ہے کوئی ہمارے جیسا مسافر ایک بار بس کے اوپر والے حصے میں سوار تو ہو گیا مگر گھبراتے ہوئے یہ کہہ کر نیچے اتر آیا کہ اوپر ڈرائیور تو ہے نہیں خدا جانے کیا بنے۔ بس ایک ڈرائیور ہی۔ کوئی کنڈکٹر بھی نہیں ہوتا ان بسوں پر۔ بس کی چھت پر لگے سپیکر اور سامنے لگی سکرین پر اگلے سٹاپوں کے بارے میں معلومات دیکھی بھی جا سکتی ہیں اور سنی بھی۔ خیر ہم تو بیٹھ گئے نادرن لائن پر۔ ٹرین بھری بھری سی تھی۔ ٹرین کے اندر اور ٹیوب سٹیشنوں پر بھی سائن بورڈ لگے تھے۔ ٹیوب کے اندر ایک نظم بھی لکھی دیکھی جو شاید پچھلی صدی میں کسی شاعر نے ٹیوب کی شان میں لکھی تھی جو آج بھی اس کے نام کے ساتھ ٹیوب میں لگی ہے۔ ایک سیٹ خالی دیکھ کر براجمان ہو گئے۔ اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو سامنے بھرے بھرے سینے اور خالی خالی کپڑوں والی ایک گوری پہ نظر پڑی جو کتاب پڑھنے میں محو تھی۔ ایک ہی نظر میں ہم نے اس کا چہرہ پڑھ ڈالا۔ بھلی لگ رہی تھی۔ دیگر مسافر بھی اخبارات، کتابیں یا پی سی ٹیبلٹ ہاتھ میں اٹھائے پڑھنے میں مصروف تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر حسنِ بے پردہ کے جلوے بکھیرتی ایک اور حسینہ بیٹھی تھی، بے حد کھلے گلے اور نچلے حصے کی ہواخوری کے لئے آدھی پھٹی جینز کے ساتھ؛ شاید یہ جتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ کوئی دھوکے میں نہ رہے جیسے اوپر سے گوری ہوں ویسے نیچے سے بھی ہوں۔ ہماری دائیں سیٹ پر ایک اور دھاکہ خیز نشیلی گوری بیٹھی تھی سوچا اس سے ہائے ہیلو کرتے ہیں۔ گپ شپ ہی سہی۔ مگر سامنے والی کو دیکھا تو اس کے لیے بھی جی للچایا۔ سو یہ فیصلہ کیا کہ ساتھ والی سے گپ شپ کریں گے اور سامنے والی شوخ حسینہ پہ گاہے گاہے نظر بھی ڈال لیا کریں گے۔

سفر ہے کٹ ہی جائے گا۔ مگر ساتھ والی سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر گلہ صاف کیا، اپنی ہمت کو جمع کرتے ہوئے بولے ’’جی بات سنئے گا‘‘ مگر آواز کہیں حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

’’یار کچھ بھی نہیں ہوتا کر لو نا بات۔‘‘ من کے اندر سے آواز آئی ’’زیادہ سے زیادہ کیا کہے گی یہی کہ سوری، آپ میری ٹائپ کے آدمی نہیں یا یہ کہ ابھی مصروف ہوں ویک اینڈ یعنی جمعے یا ہفتے کی شام کو مل سکتی ہوں۔ بس اور کیا۔ چلو شاباش بولو بھی۔‘‘

ہمارے اندر ایک جنگ جاری تھی۔

’’ابے ایک گوری سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں، چلا ہے لندن گھومنے۔‘‘ اب تو ہماری جرأت کو للکارا گیا تھا۔ لہٰذا بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر گردن گھما کر ہم نے بولا ’’ایکسیوزمی!‘‘

قدرت کی ستم گری بھی ملاحظہ کیجیے۔ عین اسی لمحے ٹرین کی چھت پر لگے سپیکر بج اٹھے۔ اگلا اسٹیشن آ چکا تھا یوں ہماری صدا نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ وہ ابھی تک موجود تھی۔ ٹرین پھر چل پڑی۔ اب کے ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی روحانی طاقتوں کو بھی یکجا کیا جائے۔ لہٰذا ایک بار آیت الکرسی اور تین بار

’’رب اشرح لی صدری و یسرلی امری‘‘

پڑھ کر سب سے نظر بچاتے ہوئے اپنے سینے پہ دم کیا۔ آیت الکرسی حفاظت کے لیے اور دوسری آیت ہچکچاہٹ دور کرنے کے لیے۔ یہی وہ دعا ہے جو حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دربار میں جانے سے قبل پڑھی تھی سو ہم نے بھی پڑھ لی۔ کیا خبر بات بن جائے تو اس گوری کو بھی مسلمان کر ڈالیں گے۔ دیکھو جی نیکی کا کوئی بھی کام ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

ایک بار پھر گردن گھمائی مناسب سے الفاظ پہلے ہی منتخب کر کے دل ہی دل میں کہنے کی پریکٹس بھی کر لی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم مدعا بیان کرتے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی منزل آ گئی تھی۔ وہ ٹرین سے اترنے والی تھی۔ لیکن یہ جو ہم نے خشوع و خضوع اور تجوید کے ساتھ آیت الکرسی کی تلاوت کی ہے، اس کا کیا

ہوگا۔ دس نیکیاں فی حرف کے حساب سے تو پاکستان میں بھی مل جاتی ہیں یہاں تو ہم نے عین کفار و مشرکین کے درمیان زیر زمین چلتی ٹرین پر بیٹھ کر پڑھی ہیں۔ چالیس نیکیاں فی حرف سے کم کسی طور بھی رضامند نہ ہوں گے۔ لہٰذا حروف کی تعداد گنی اور ۴۰ سے ضرب دی۔ مبلغ چار ہزار نیکیاں نصف جن کے دو ہزار بنتے ہیں۔۔۔ فرشتۂ مہربان سے رسید بھی لے لی تا کہ سند رہے اور بروز قیامت کام آئے۔ دائیں کندھے والے فرشتے کو نیکیاں لکھنے میں مصروف پایا تو سوچا بائیں کندھے والے فرشتے کی مصروفیت کا بھی کوئی کام نکالا جائے مگر استغفار پڑھتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔ بائیں والے ننھے فرشتے آج تم چھٹی کرلو! ویسے بھی اتنا زیادہ کام تمہاری صحت کے لئے اچھا نہیں، ہاں اگر لکھنے پڑھنے کا تمہیں اتنا ہی شوق ہے تو دائیں کندھے پہ جا بیٹھو، بلکہ اسے اپنا ہی گھر سمجھتے ہوئے لیٹ جاؤ اور لیٹے لیٹے نیکیاں لکھنے کا نیک کام بھی جاری رکھو! اور پہلے سے موجود دائیں والے فرشتے کو بھی ذرا جگا دو اور کہو نیکیاں لکھنے میں سستی مت کرے پہلے ہی بہت کم ہیں۔۔۔ شاباش!

''اتنی بڑی خدمت کا صلہ محض شاباش ہی؟''

نہیں نہیں، جنت میں پہنچ کر ۷۲ کی وصولی کر لینے دو ایک آدھ حور تمہیں بھی بخش دیں گے۔ یوں بھی ہمارے حساب کتاب اور جزا سزا کے بعد تمہیں ریٹائرڈ ہی ہونا ہے نا تو ''ریٹائرڈ لائف'' میں ہماری عطا کردہ حوروں سے جی بہلاتے رہنا! اور خبر دار حساب کتاب میں ذرا بھی گڑبڑ کی تو؟ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے داروغۂ جہنم سے ہماری ذاتی تعلقات ہیں، جہنمیوں کو پیپ اور کھولتا ہوا گرم پانی پلانے کے لئے تمہارا ٹرانسفر جہنم میں کروا دیں گے۔ ذرا رکو تو، ہمارا حساب کتاب لینے سے پہلے ذرا اپنا حساب کتاب تو دو۔ یہ جو ازل سے ہمارے کاندھوں پہ سوار ہو اس کا کرایہ کون دے گا؟ دیکھتے نہیں کہ والدین بھی ایک خاص مدت تک بچوں کو کندھوں کی سواری کراتے ہیں، مگر تم تو چٹ ہی گئے۔ دائیں کندھے والے فرشتے کی اور بات ہے وہ بیچارہ تو نیکیاں ہی لکھتا رہتا ہے۔ مگر تم۔۔۔ لندن میں ویسے بھی مکان بہت مہنگے ہیں، کرایہ نکالو یا گھر خالی کرو، ہم نے یہاں بھی نیکیاں لکھنے والا فرشتہ شفٹ کروانا ہے''

اب ہمیں بھی ٹرین بدلنی تھی۔ سٹاک ویل اسٹیشن سے وکٹوریہ لائن پہ جانا تھا۔ ٹرین میں اس قدر رش تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مرد و زن مسافر آپس میں ایسے گتھم گتھا کہ تو من شدی من تو شدم والی کیفیت تھی، مگر صبر، خاموشی اور احترام کے ساتھ سفر کرتے مسافر دوسروں کی غلطی پر بھی خود مسکراتے ہوئے معذرت کر لیتے۔ ہمارے ہاں اگر ایسا ہوتا تو دس منٹ کے اس سفر میں نہ صرف بیس مرتبہ جیب کتروا چکے ہوتے بلکہ کئی ماموں لوگ بھی غیرت کے نام پر ایک دوسرے کی گردن کاٹ چکے ہوتے کہ تمھارا جوتا اس لڑکی کے جوتے سے کیوں ٹکرا گیا ہے۔ ٹیوب سٹیشن سے باہر نکلتے بھی رش کا یہی عالم تھا۔ جیسے کسی فلم کو فاسٹ فارورڈ پر لگا دیا گیا ہو۔ مگر کمال یہ کہ نہ کوئی دھکم پیل نہ گالی گلوچ نہ کوئی ٹکراؤ۔

نیچرل ہسٹری میوزم

فیصلہ یہ ہوا تھا کہ کسی خاص ترتیب کے بغیر جو جی میں آیا، دیکھتے چلیں گے۔ لہٰذا پہلے ساؤتھ کنزیگٹن میں واقع نیچرل ہسٹری میوزیم میں جا پہنچے۔ یہ میوزیم دنیا کے پانچ بڑے عجائب گھروں میں شمار ہوتا ہے۔ دو کروڑ کے قریب اشیاء موجود ہیں جنھیں بڑی مہارت سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ میوزیم میں داخل ہوتے ہی آپ اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ عین دروازے کے سامنے کئی میٹر لمبا ڈائنوسار کا ڈھانچہ دیکھنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ہیبت بھی طاری کر دیتا ہے اور میوزیم کے باہر کے ماحول سے یکسر مختلف اندر کے ماحول میں کھینچ لیتا ہے۔ کئی قسم کے جانوروں کے ارتقائی مراحل کو بھی دکھایا گیا ہے۔ ایک حصہ انسانی ارتقاء کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ جب ننگ دھڑنگ انسان غاروں میں رہا کرتا تو اپنے دشمنوں یعنی خونخوار درندوں اور موسم کی سختیوں سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ پیٹ کا جہنم بھرنے کی تگ و دو کیا کرتا۔ نت نئے چھری کانٹے اور شکاری اوزار بنانے میں لگا رہتا۔ قدیم انسان نے جب جنگلی جانوروں اور

موسموں سے نمٹنے کا خاطر خواہ بندوبست کر لیا تو آپس کی دشمنی مول لے لی۔ اب وہ دوسرے انسانوں کی املاک اور طاقت کو بھی زیرنگین کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا پتھروں کی جگہ تیر، تلوار اور نیزوں نے لے لی۔ ایک ہی جھٹکے میں گردن اڑا دینے والے ہتھیاروں کو چلتا دیکھ کر فرشتے بھی پکار اٹھے کہ تخلیق آدم پر فساد فی الارض کا ہمارا اندیشہ درست تھا مگر قدرت کی وہی صدا کہ ''جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے'' بھی گونج رہی تھی۔ جوں جوں دنیا کی آبادی بڑھتی گئی توں توں جان لیوا ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تاریخ دان کہتے ہیں کہ دنیا میں جب سے انسان آباد ہوا، تب سے ہر وقت کسی نہ کسی کونے پر جنگ جاری ہی رہی ہے۔ محض دس سال زمین پر مسلسل امن کے گزرے ہیں۔ ان دس سالوں میں بھی شیر دل جوان پھول پتیاں نہیں اگاتے رہے بلکہ اگلی جنگ کی تیاری میں مصروف رہے ہیں اور آج دنیا دو تباہ کن عالمی جنگیں دیکھ چکی ہے اور تیسری عالمی جنگ کے لیے پر تول رہی ہے۔

میوزیم میں کئی قسم کے جانور اور پرندوں کے ارتقا کو مختلف تصاویر اور حقائق کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ایک کونے میں بٹیر، مرغ اور بطخوں کے بنے ڈھانچوں پر نظر پڑی تو ہم بھی چہک اٹھے۔ ساتھ ہی مرغوں اور بٹیروں کی آواز بھی چھت پر لگے سپیکروں سے آ رہی تھی۔ یہ تو گویا چلتے چلتے اپنے ہی محلے میں آ گئے۔

یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

سائنس میوزیم

نیچرل ہسٹری میوزیم کے بغل میں سائنس میوزیم اپنی آن بان اور شان کے ساتھ رنگ بکھیر رہا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۸۵۷ء میں رکھی گئی۔ سالانہ تیس لاکھ کے قریب سیاح آ دھمکتے ہیں۔ جن میں سے ایک ہم بھی ہیں باقی ۲۹ لاکھ ۹ ہزار نو سو ننانوے رب جانے کون کون ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں بھی داخلہ مفت ہے لہٰذا ہم سینہ تان کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ نچلے حصے کے مرکزی ہال میں زمین کا گولا گردش میں ہے اور زمین کی موجودہ صورتحال سے آگاہ کر رہا ہے۔ اسے ہاتھ لگانا

منع ہے۔ دور سے اپنے اپنے ملک یا براعظم کو لکیروں کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں اور بس۔ اس میوزیم میں سائنسی عجائبات کے تین لاکھ آئٹم رکھے گئے ہیں۔ سب سے پہلا فون، کمپیوٹر، ریڈیو، سائیکل، کار، بڑے بڑے انجن اور دنیا کے پہلے ٹائپ رائٹر کے ڈاکومنٹس بھی اور آخری بننے والا ٹائپ رائٹر بھی۔ ایک حصہ ہوائی جہازوں کے لیے مختص کیا گیا ہے جس میں رائٹ برادران کے جہاز سے لے کر جدید ترین مسافر بردار اور لڑاکا طیاروں کے ماڈل بھی نصب ہیں۔ ایک طرف خلائی ترویج اور ترقی کے ادوار دکھائے گئے ہیں۔ خلائی سوٹ، راکٹ اور جانے کیا کیا بلائیں۔ نیچے ایک سینما ہال بھی ہے۔ محض پانچ پاؤنڈ کے ٹکٹ میں آپ سہ رخی (3D) سینما ہال میں چاند گاڑی میں بیٹھ کر خلا کی سیر کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اوپر والے ہال میں بھی آئی میکس اور 3D سینما ہال ہیں جن میں سائنس کے مختلف موضوعات پر فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ہم تو سلطان راہی کی فلمیں ہی دیکھنے کے عادی تھے مگر یہاں مختلف تجربہ ہوا۔ اس کے علاوہ میوزیم کے کانفرنس ہال میں مختلف سائنسی موضوعات پر کانفرنسیں بھی ہوتی ہیں اور موجودہ دور کے عظیم ترین اور آئزک نیوٹن کے بعد کے ذہین ترین سائنس دان اور کازمالوجسٹ ڈاکٹر سٹیفن ہاکنگ بھی یہاں لیکچر دیتے ہیں۔

ہاکنگ بنیادی طور پر کائنات کے تخلیقی نظریے بگ بینگ کے خالق ہیں۔ بگ بینگ تھیوری کے مطابق کائنات کو وجود میں آئے تیرہ ارب اسی کروڑ سال ہو چکے ہیں۔ تخلیقِ کائنات سے قبل کچھ بھی نہیں تھا، محض ایک نکتے میں سب کچھ تھا۔ پھر ایک زوردار دھماکا ہوا اور ناقابلِ تصور تیز رفتار روشنی دیگر عوامل کے ساتھ پھیلتی چلی گئی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کہکشائیں اور نظامِ شمسی وجود میں آئے۔ ہماری زمین محض ساڑھے چار ارب سال قبل وجود میں آئی اور انسانی ارتقا کو فقط پچاس ہزار یا ایک لاکھ سال ہی ہوا ہے۔ عظیم دھماکے یعنی بگ بینگ کو قرآن سترہویں پارے میں ففتقنٰھما کی صورت میں بیان کرتا ہے اور کائناتی وسعت اور پھیلاؤ کے بارے میں بھی ستائیسویں پارے میں وَ اِنَّا لَمُوسِعُون کے الفاظ میں آج سے چودہ سال قبل سے ہی تصدیق کر رہا ہے۔

ڈاکٹر سٹیفن ہاکنگ جسمانی طور پر مکمل طور پر معذور ہیں صرف آنکھ کے پپوٹے ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ ایک خاص کمپیوٹر ان کے دماغ کی ریڈیائی لہروں کو پڑھ کر آواز میں بدل دیتا ہے جس سے سامعین مستفید ہوتے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں

بلیک ہول کو گرے ہول کہہ کر سائنسی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، مگر ہم مسلمانوں کو اس سے کیا غرض، ہم نے آلو پہ لکھا اللہ کا نام دریافت کرلیا، یہی بہت ہے۔ اس کے علاوہ کتنے اہم مسائل بھی تو ابھی حل پذیر ہیں یعنی قل خوانی جائز ہے یا ناجائز۔ جنازے کے بعد دعا مانگنی چاہیے کہ نہیں۔ آیا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں کے اوپر رکھنا چاہیے یا گھٹنوں سے ذرا نیچے ہو۔

لندن آئی اور ہاؤس آف پارلیمنٹ

اسے ملینیم ویل بھی کہا جاتا ہے جس کی کل لمبائی ۱۳۵ میٹر ہے یہ یورپ کا سب سے بڑا سیاحتی ویل یعنی لمبا تڑنگا گول مٹول سا جھولا یا پہیہ ہے جس میں سیاحوں کے بیٹھنے کے لیے شیشے کے بڑے بڑے کیپسول بنے ہوئے ہیں جن میں بیٹھ کر آپ لندن بھر کا فضائی نظارہ کر سکتے ہیں کیونکہ بلندی پہ ہونے کی وجہ سے بلند و بالا عمارتیں بھی حائل نہیں ہوتیں۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء میں اس وقت کے وزیراعظم نے افتتاح کیا تھا جس کی سواری جون ۲۰۰۸ء تک ہی تین کروڑ سیاح کر چکے ہیں۔ یہ دریائے ٹیمز کے کنارے واقع ہے۔ دریائے ٹیمز بھی لندن کی زندگی میں شاہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دریا کی کل لمبائی ۲۱۵ میل ہے۔ شروع کے آباد کار اسی دریا کے کنارے ہی بستیاں بسا کر رہتے تھے اور ہزاروں سال بعد یہ شہر دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ دریائے ٹیم برطانیہ

کا سب سے بڑا اور یو کے کا دوسرا بڑا دریا ہے۔ دریا کو گھورتے ہوئے ہم پل پر پہنچے۔ پیچھے لندن آئی اور سامنے بگ بن اور کچھ آگے ہاؤس آف پارلیمنٹ واقع ہے۔ بگ بین کا اصل نام تو کلاک ٹاور ہے مگر پیار سے می ڈیڈی اسے بگ بین (نک نیم) کہتے ہیں۔ یہ ویسٹ منسٹر کے محل میں واقع ہے۔ لندن کی پہچان! یہ اب تک ہزاروں فلموں اور اس طرح کی دوسری ویڈیوز میں بھی دکھایا جا چکا ہے۔ کچھ آگے ہی لندن کی اہم ترین اور پرکشش عمارت ہاؤس آف پارلیمنٹ واقع ہے جس کی بنیاد ۱۸۶۸ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کے احاطے میں ۱۰ ملکی اور غیر ملکی سربراہان کے مجسمے بھی نصب ہیں اور اب گیارھواں مجسمہ مہاتما گاندھی کا ۲۰۱۵ء میں یہاں نصب کیا گیا ہے۔

دوسرے ممالک کے پرچم بھی لان کی خوبصورتی میں اضافہ کیے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کئی موقعوں پر احتجاجی مظاہرین بھی یہاں اپنا رنگ دکھا چکے ہیں۔

اپنی مدد آپ کے تحت ہاؤس آف پارلیمنٹ کے سامنے اپنی فوٹو اتار کے ہم اگلی منزل کو روانہ ہونے والے تھے کہ ایک میٹھی سی آواز سنائی دی

"Would you take my picture please"

پہلے تو سماعت کا دھوکہ سمجھ کے نظر انداز کرنے والے تھے کہ اس نے خوبصورت ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے اپنا کیمرہ ہماری طرف بڑھا دیا اور بگ بین کے سامنے پوز بنانے لگی ''ٹھیک لگ رہی ہوں نا!''

کلک سے پہلے وہ اس بات کا یقین کرنا چاہتی تھی کہ تصویر اچھی آئے۔

کیمرے کا بٹن دباتے ہی اس دل کا بٹن بھی دب گیا وہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگی ''کچھ اور بھی پلیز!''

اس نے اپنی چند اور تصاویر اتارنے کی درخواست کی اور ہم ساتھ ساتھ چلتے، ہنستے گاتے لندن کے ایک اور خوبصورت منظر پہ پہنچ گئے۔

''ہاں یہ اچھا رہے گا!'' اس نے ایک اور پوز بنایا اور ہم نے

ایک اور خواب سجالیا۔

''ذرا ناک چپٹی ہے، قد بھی ٹھیک ہے، چلے گی۔'' ہم دل ہی دل میں سوچنے لگے۔

''بھئی دیکھو! ساری دنیا کو چھوڑ کے اس نے ہمارا انتخاب کیا ہے۔ آخر کوئی تو بات ہے ۔کاش ٹائی لگا کر آتے تو اور اچھا امپریشن پڑتا تھا۔''

دلِ ناداں نے بھی تسلی دی ''اجی چھوڑیے لباس میں کیا رکھا ہے، کوئی دل کو بھا جائے کیا یہ کم ہے۔''

اس نے کسی اور راہ چلتے سے گزارش کی تا کہ ہم دونوں کی تصویر ایک ساتھ بھی بن سکے۔ اس نے پہلے کیمرے سے اور بعد میں ہمارے موبائل سے تصویر بنوائی۔ بہت ہی پاس ٹھہر کر۔ تقریباً لپٹ کر ہی۔ ہمارا دل سینے میں اچھلنے لگا۔

''دیکھو وہ اگر شادی کا بولے تو انکار مت کرنا، کسی کا دل توڑنا بھی تو گناہِ عظیم ہے۔'' دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔

''نجانے بچے کیسے پیدا ہوں گے۔ آدھے نیلے اور آدھے کالے۔''

اب ہم دریائے ٹیمز کے پل کے عین اوپر تھے۔ پیچھے بہتا دریا اور دھیرے دھیرے چلتا لندن آئی کا پہیہ دیکھ کر وہ رک گئی

''یہاں بھی ایک تصویر بناؤ پلیز۔''

اس نے کئی انداز سے تصویر بنوائی۔ ہم بھی بڑے شوق سے فوٹوگرافی کر رہے تھے جیسے لندن آئے ہی اسی کام سے ہوں۔

دل میں سوچ رہے تھے کہ بچوں کا نام کیا رکھیں گے۔ انگریزوں والا یا مسلمانوں والا۔ وہ تو ظاہری بات ہے مسلمانوں والا ہی۔ آخر باپ تو ہم ہی ہوں گے نا! وہ تو ہوگی ماں بیچاری۔ ایک عورت ہی۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی کیا مجال کہ کسی بھی معاملے میں اپنی مرضی جتائے۔ خواہ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا بیٹی۔ ہے تو کم عقل ہی نا۔۔۔ پاؤں کی جوتی۔ اخباریں پڑھ کر یا ٹی وی وغیرہ دیکھ کر یا کسی کالج اور یونیورسٹی کی ڈگری لے کر خود کو چالاک سمجھتی ہے کیا۔ کورٹ کے احاطے یا بھری پنچائت میں ہی اینٹوں سے سنگسار نہ کیا تو اپنا بھی نام نہیں۔

''میں فلپائن سے ہوں اور آپ؟'' اس نے ایک بار پھر گلے سے لگایا اور اپنا اتا پتا بتاتے ہوئے ہمارا بھی پوچھنے لگی۔ شاید وہ بھی لندن گھومنے کو آئی تھی۔

''پاکستان۔''

''اوہ پاکستان سے۔'' اس نے حیرت کا اظہار کیا، کیمرہ واپس لیا اور چل دی۔

''کم بخت دل تو واپس کرتی جا!''

مادام تساؤ میوزیم، زندوں کا قبرستان

ذرا اس مردہ شدہ جیتی جاگتی دنیا کا مظاہرہ بھی کیجیے۔ یہ میوزیم فرانس والی سرکار میری تساؤ کے نام پر ہے جس نے موی مجسمے بنانے کا فنکارانہ کام شروع کیا تھا۔ اس خوبصورت اور کمال فن سے جس کا بھی انتخاب کیا اُسے امر کر ڈالا، جیسے زندہ ہو اور سانس لینے کا وقفہ کر رہا ہو۔ ۱۷۷۰ء میں نہ صرف والٹر جیسے مشہور لوگوں کو مجسم کیا بلکہ انقلابِ فرانس کے دوران ظلمتوں کا شکار ہونے والوں کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے امر کر دیا۔ ۱۸۰۲ء میں لندن میں آئی مگر نپولین دور کی جنگ کے بعد واپس جانا ممکن نہ رہا

اور یہیں کی ہو کے رہ گئی۔ اس نے برطانیہ بھر کا سفر کیا اور اپنی تخلیقات سے لوگوں کو محظوظ کرنے لگی۔ بعدازاں مجسموں کا جمعہ بازار لگانے کے لیے بیکر سٹریٹ بازار میں کرائے کی جگہ لے کر کام چلانے لگی۔ یوں ۱۸۳۵ء میں میڈم نے اپنا ہی مجسموں کا عجائب گھر کھول ڈالا۔ اب تک کئی بڑے عمائدین اور سیاسی قائدین کے مجسمے وہ بنا چکی تھی جو اب بھی میوزیم میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ نیلسن منڈیلا، مہاتما گاندھی، بالی ووڈ اور ہالی ووڈ کے اداکار بھی یہاں جلوہ نما ہیں۔ پاکستانی آرٹسٹ معین اختر دوبارہ جی اٹھنے کے لیے مومی پتلا بننے کے انتظار میں ہیں۔ یہ پہلا پاکستانی آرٹسٹ ہے جس کا پتلا یہاں لگے گا۔ مگر حضرت باصر سلطان کاظمی فرماتے ہیں کہ محترمہ بینظیر بھٹو صاحبہ کا مومی مجسمہ بھی یہاں کی رونق میں اضافہ کیے ہوئے ہے، بھئی سچ پوچھیے تو ہم تو چند نا قابلِ بیان وجوہات کی بنا پر ان گنہگار آنکھوں سے بی بی کے مجسمے کی زیارت نہ کر سکے، یعنی اس روز ہم باوضو نہ تھے۔ مگر باصر صاحب فرماتے ہیں تو سچ ہی ہوگا۔ اگرچہ بعد میں ہم نے بزرگانِ دین و دنیا سے بھی یہی سنا کہ بی بی یہاں موجود ہیں تو قائل ہو ہی گئے اور ان بزرگوار ہستیوں میں نانی گوگل (Google)، (Yahoo) یاہو تایا اور پی ڈی شریف والے وکی بڑے بھائی صاحب (Wikipedia) شامل ہیں۔ اب ایسے بزرگوں کو جھٹلانا گویا دنیا و آخرت میں اپنی ہی رسوائی مول لینے والی بات ہے۔

ٹاور آف لندن اور لندن برج

مرکزی لندن میں واقع ٹاور آف لندن ایک تاریخی قلعہ ہے جس کی بنیادیں ۱۰۶۶ء میں رکھی گئیں اور اسے ۱۱۰۰ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک دشمنوں کو سبق سکھانے کے لیے جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ اگرچہ قلعے کی تعمیر کا بنیادی مقصد قید و بند کے لیے استعمال کرنا نہ تھا۔ یہ ٹاور کئی عمارتوں کا ایک پیچیدہ گورکھ دھندا ہے۔ ٹاور کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ شاہی تیر و تلوار سمیت تاج برطانیہ بھی اسی قلعے میں رکھا ہوا ہے اور سونے کی چڑیا ہندوستان کے گلے سے نوچا ہوا کوہِ نور ہیرا ابھی تراش خراش کے

بعد اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ قلعے کا کل رقبہ ۱۲ ایکٹر ہے اور یہ بھی لندن کے تاریخی مقامات میں سے ایک ہے جسے ۲۰۱۲ء تک ۲۴ لاکھ سیاح دیکھ چکے ہیں۔ کچھ ہی فاصلے پر دریائے ٹیمز کے کنارے لندن برج واقع ہے۔ موجودہ پل کا افتتاح ۱۹۷۳ء میں کیا گیا اور اس کی کل لمبائی ۲۷۰ میٹر ہے۔

نویں صدی عیسوی سے ہی یہ پل ایک تجارتی رہگزر کے طور پر کام بھی دے رہا ہے۔ یہ پل عمر میں لندن بھیا سے بھی بڑا ہے کیونکہ شہر ابھی وجود میں بھی نہیں آیا تھا کہ پل کو پہلی بار تھڈے کہہ دیا گیا تھا اور نام بھی لندن برج بعد میں رکھا گیا۔ اس کی تاریخ کے ڈانڈے ۷۰ ق م میں رومی دورِ حکومت سے جا ملتے ہیں۔ جنھوں نے اس پل سمیت ایسے متعدد پل تجارتی راہ گزر اور فوجی نقل و حمل کے لیے بنائے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی تک رومی حکمران رہے۔ بعد میں آنے والے بھی اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ ملاتے رہے۔ مگر اٹھارویں صدی میں اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا کیونکہ یہ تنگ بھی تھا اور تنگ نظر بھی۔ کہنے والے کہتے ہیں ۱۸۹۶ء تک یہ پل لندن کا مصروف ترین مقام تھا۔

بکنگھم پیلس اور ہائیڈ پارک

یہی وہ محل ہے جہاں سے ملکۂ برطانیہ تاج برطانیہ سر پہ سجائے بالکونی میں آ کر نہ صرف دیدار کراتی ہے بلکہ یہ محل شاہی خاندان کا مسکن ہونے کے ناطے ریاستی معاملات بھی یہیں سے چلائے جاتے ہیں۔ جس عمر میں ملکہ پہنچ چکی ہے اگر کسی اور جگہ ہوتی تو بچوں کو ڈرا کر سلانے، خاموش کرانے اور چاند میں بیٹھی چرخہ کاتنے والی باجی کی کہانیاں سنانے کے لیے استعمال کی جا رہی ہوتی مگر ملکہ عالیہ تو اس عمر میں بھی چاک و چوبند ہیں۔ وہ تاجِ برطانیہ کی وارث ہیں۔ شہنشاہیت کا یہ تاج انہوں نے ۱۹۵۲ء میں اپنے سر پہ سجایا جو ابھی تک وہیں کا وہیں ہے اور بیچارے شہزادہ چارلس ان کے بعد بادشاہ بننے کے طویل انتظار کی وجہ سے ورلڈ ریکارڈ بھی بنا چکے ہیں۔ برطانوی راج دنیا کی پانچویں بڑی تاریخی بادشاہت سمجھی جاتی ہے۔ ایک وقت میں ان کی حکومت کا دائرہ کار ایک کروڑ تیس لاکھ مربع میل پہ مشتمل تھا جو دنیا کے کل زمینی رقبے کا چوتھا حصہ بنتا ہے اور ان کا راج بھی پانچ سو ملین افراد پہ تھا جو اس وقت کی دنیا کی کل آبادی کا چوتھائی حصہ بنتا ہے۔ برطانوی سامراج نے دنیا بھر میں نہ صرف سیاسی اور قانونی اصلاحات متعارف کرائیں بلکہ تہذیبی اور ثقافتی اثر کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کو بھی دنیا میں عام کیا جواب بھی دنیا کی دوسری بڑی بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔

بکنگھم پیلس میں ملکہ وکٹوریہ نے پہلی بار رہائش اختیار کی۔ جہازی سائز محل میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ شاہی خاندان کی رہائش کے لیے ایک چھوٹی مگر قدرے آرام دہ شاہی رہائش محل کے اندر ہی تعمیر کی جائے چنانچہ بکنگھم ہاؤس کی تزئین و آرائش شروع کی گئی اور بالآخر ۱۸۳۴ء میں وہ شاہی رہائش گاہ بن گیا۔ مگر ایسی قسمت کہاں کہ رنگ رلیاں منائی جاتیں۔ ۱۸۳۷ء میں ہی اس میں نامعلوم ذرائع سے آگ لگ گئی یہی نامعلوم ہاتھ آج بھی کراچی کو جلا رہے ہیں۔ مگر یہاں معاملات مختلف ہیں۔ آگ لگنے کی وجوہات بھی سامنے آ گئیں تھیں اور کنٹرول بھی کر لیا گیا تھا۔ اس محل کو بعد میں پارلیمنٹ ہاؤس میں بھی تبدیل کرنے کا سوچا گیا تھا مگر یہ خیال پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا بلکہ محل کے متاثرہ حصے کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

محل کا کل رقبہ ۷۷,۰۰۰ مربع میٹر ہے۔ محل کے سامنے ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ بھی نصب کیا گیا ہے۔ یہ یادگاری مجسمہ ۱۹۱۱ء میں ایستادہ کیا گیا جو محل کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس کے محل کے سائے میں ہی ہائیڈ پارک اپنی تمام تر وسعتوں اور رعنائیوں سمیت واقع ہے۔ یہ لندن کا سب سے بڑا پارک بھی ہے اور شاہی

پارکوں میں سے ایک بھی۔ یہ پارک نہ صرف احتجاجیوں، دھرنے بازوں اور لانگ مارچ کے شوقین حضرات کا روایتی مقام ہے بلکہ اپنی وسعت کی وجہ سے کئی میگا اور یادگار میوزیکل ایونٹس کی میزبانی بھی کر چکا ہے جس میں دو لاکھ سے زائد موسیقی سے محبت کرنے والے بیک وقت جمع ہو چکے ہیں۔ دلوں کی شہزادی لیڈی ڈیانا کا یادگاری مجسمہ بھی اسی پارک میں نصب ہے اور لندن میں ۷/۷ میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعے میں ہلاک ہونے والوں کی یادگار بھی نصب ہے۔

زیفر بلاٹ کیفے۔ وقت کی قیمت چکایئے، چائے کافی مفت میں:

آیئے اب آپ کو لیے چلتے ہیں دنیا کے انوکھے زیفر بلاٹ کیفے یا ہوٹل میں، لندن کی اولڈ سٹریٹ میں واقع کیفے دراصل روسی ریستورانوں کی ایک شاخ ہے۔ زیفر بلاٹ روسی لفظ ہے جس کا مطلب ہے گھڑیال یا کلاک فیس۔ اب تک تو ہم نے روسی ٹریکٹر ہی دیکھے سنے تھے یا فلموں اور طالبان کے پاس روسی ساختہ اے کے ۴۷۔ مگر یہاں رنگ ہی نرالا ہے۔ یہاں آپ کو گھر جیسے ماحول میں چائے، کافی، پھل، دودھ اور کیک، بسکٹ ملیں گے اپنی مدد آپ کے تحت۔ وہ بھی مفت!۔۔۔جی ہاں بالکل مفت۔ بس آپ کو وقت کی قیمت چکانی ہے۔ جتنا وقت گزاریں گے تین پینی فی منٹ کے حساب سے۔ چاہے دن بھر رکے رہیں چاہے دس منٹ ہی۔ سب آپ کی مرضی پہ منحصر ہے۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی کاؤنٹر والی آپ کو ایک چھوٹی سی گھڑی تھما دے گی جسے آپ اپنے میز پر رکھ لیں گے اور جاتے ہوئے جتنا وقت گھڑی نے کاٹا ہوگا اتنا ہی آپ کا بل بنے گا۔ یہی نہیں بلکہ آپ مفت میں کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ بھی استعمال کر سکتے ہیں اور آلاتِ موسیقی سے بھی چھیڑ خانی کرتے ہوئے جی کو بہلا سکتے ہیں۔ ہے نا انوکھا ریسٹورنٹ۔

ٹریفلگار سکوائر

سنٹرل لندن میں واقع یہ لندن کا پرکشش سیاحتی مقام ہے جسے ماضی میں چیئرنگ کراس کے نام سے بھی جانا جاتا رہا۔ اس کے تین اطراف سے سڑکیں نکلتی ہیں۔ نیلسن کا کالم اس کا مرکزی مقام ہے۔ اسے ۳۹-۱۹۳۷ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ یہیں پر ہی

لندن والے ہر سال آٹھ مئی کو VE Day منانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔VE Day کا مطلب معلوم ہے کیا؟ نہیں نا! آپ کے ٹھاٹھیں مارتے علم کے سمندر کا پتا ہے ہمیں۔ گھبرائیں مت یہ امتحانی سوال نہیں محض معلومات ہیں۔ لو آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ دراصل آٹھ مئی ۱۹۴۵ء کو دوسری جنگ عظیم میں جرمن نازیوں کے خلاف فتح کی خبر سننے کے لیے لندن والے بے تاب تھے اور اسی جگہ جمع ہو گئے تھے جہاں سے آج ہم آپ کو تاریخ کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ فتح کی خبر ملتے ہی منچلوں نے ڈھول کی تھاپ پہ دھمال ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، ہر سال یہاں پر Victory in Europe day منایا جاتا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے، ہمیں بھی ان سب باتوں کا آج ہی پتا چلا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ مقام سیاسی سرگرمیوں کا بھی مرکز رہا ہے۔ ہر سال کرسمس لائٹ بھی جلائی جاتی ہیں۔ جلسے جلوسوں اور سیاسی سرگرمیوں کو کم کرنے کے لیے چالاک انگریزوں نے ہجوم کو کم کرنے کے لیے اس مہارت سے درمیان میں پانی کا فوارہ لگا دیا کہ جگہ کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہو اور رش بھی ختم ہو جائے۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس کے شمال کی طرف دنیا کا پانچواں بڑا میوزیم یعنی نیشنل آرٹ گیلری واقع ہے جو ۱۸۲۴ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس میں تیرھویں صدی سے لے کر ۱۹۰۰ء تک کی دنیا بھر میں سے تاریخی، مشہور اور آرٹ کے نادر و نایاب نمونے موجود ہیں۔ ذرا اس طرف کو مڑ کے دیکھیے۔ نیلسن کالم پہ ٹنگا لارڈ نیلسن کا مجسمہ۔ جس کے پاؤں میں ایک دھاڑتا شیر پڑا ہے چھ فٹ کا نیلسن ۷۰ افٹ کے کھمبے پر تلوار لٹکائے کھڑا ہے۔ یہ یادگار ایڈمرل لارڈ نیلسن کی فتح کی نشانی ہے جو اس نے ۱۸۰۵ء میں ٹریفلگار کی لڑائی میں حاصل کی تھی۔

برٹش لائبریری

”آیئے آپ کو لئے چلتے ہیں برٹش لائبریری۔“

”کیوں وہاں کیا ہے، بس کتابیں ہی نا، اور کیا؟ کیا یہ اچھا نہیں کہ لندن کی گلیوں میں کچھ دیر اور گھوما جائے، کتنی رونق اور چہل پہل ہے حسیناؤں کا اُمڈتا ہوا ایک سیلاب۔۔۔ کتابیں دیکھ کے کیا کرنا۔“

”بھئی آؤ تو وہاں بھی بہت رونق ہے، کتابوں سے دوستی کر لو زندگی سنور جائے گی۔“

یوسٹن ٹیوب سٹیشن اور سینٹ پیکریاز ٹیوب سٹیشن کے پاس ہی یوسٹن روڈ پہ یہ رہی برٹش لائبریری۔ مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی یہ جو کانسی کا دیوہیکل مجسمہ پڑا ہے یہ خدائے طبیعیات (فلسفی، ریاضی دان اور کیمیا دان) سر آئزک نیوٹن کی روح کو ایصالِ ثواب کی غرض سے ولیم بلیک سے متاثرہ ایک مایہ ناز آرٹسٹ 'Eduardo Paolozzi'' نے تخلیق کیا جو یہاں لائبریری میں نصب کیا گیا، خدا بخشے مرحوم کو؛ حرکت کے قوانین اور ستاروں کے چال چلن بارے کئی پیچیدہ نظریات اور مساوات پیش کر کے دنیائے علم کی ہیئت ہی بدل کے رکھ دی، حالانکہ وہ بخشش کے قابل ہے ہی نہیں۔ بھئی صاف ظاہر ہے اس نے سیدھے سادھے اور بھلے مانس، قسمت والی لکیر کے فقیر، خچر اور گھوڑوں جیسے مبارک، شریف اور وفادار جانوروں کی سواری کرنے والے مسلمانوں کو بے ڈھنگی مساوات اور جہازوں جیسی پیچیدہ مشینوں میں الجھا کے رکھ دیا ہے۔ حرکت کا پہلا قانون (Newton's First Law of Motion) تو پہلی 'حرکت' سمجھ کے نظر انداز کیا جاسکتا تھا مگر اس ابو جہل کے ابو نے یکے بعد دیگرے دوسرا اور تیسرا قانون دے کر، کافرانہ روش اپنا کر مسلمانوں کے خلاف اس چند روزہ دنیا میں جس امریکی سازش میں حصہ لیا ہے وہ نا قابلِ معافی اور نا قابلِ تلافی جرم ہے، بات یہیں تک ہی نہیں بلکہ شیطان کے اس چیلے نے تو کشش ثقل اور اس جیسی کئی خرافات بک کے خود ہی اپنی عاقبت خراب کر لی ہے ۔خدا اس کافرِ اعظم کو اسفل سفلین میں بھی نچلا ترین مقام عطا فرمائے اور اس کی ناپاک روح اور جسم کو جہنمی کیڑے کھائیں (با آوازِ بلند کہیے آمین) کافروں کے ملک انگلستان ہی میں پیدا ہونے والے اس کافر کی پیدائش کا سال تو دیکھئے کہ جس سال دور بین والا گلیلیو مرا اسی سال ۲۵ دسمبر ۱۶۴۲ء میں یہ پیدا ہوا، بہتر تھا کہ دادی اس کو پال پوس کر جوان کرنے کی بجائے گلا گھونٹ کے مار ہی دیتی۔ حالانکہ بعد میں مسلمانوں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں بلکہ شیر دل نڈر سپاہی کی طرح ان مسلم دشمن ایجادات کا مقابلہ بھی کیا۔ یعنی جب پہلی بار ان مشرکینِ مکہ کی اولادوں نے چاند پہ قدم رکھا تو مسلمانوں نے نہ صرف اس بات کو ماننے سے ہی صاف صاف انکار کر دیا بلکہ یہ فتویٰ بھی دے دیا کہ جو بھی اس فتنے پر یقین رکھے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ اور جب چھاپہ خانے یورپ سے ترکی منتقل ہونے لگے تو خلافتِ عثمانیہ کے مفتیانِ اعظم نے اسے مقدس کتب کی بے حرمتی جانتے ہوئے ''حرام'' قرار دے دیا۔ فتوے کی سچائی ملاحظہ کیجئے کہ ہندوستانی مفتیوں نے بھی اس فتوے کو برقرار رکھا۔ ہندوستانی مفتیوں نے تو ریل کا سفر کرنے والوں کو بھی ناکوں چنے چبوائے کہ جو ریل گاڑی کا سفر کرے گا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ جب بات نہ بنی تو انگریزوں سے بدلہ لینے کی غرض سے ان کی بنائی ہوئی اس ٹرین پر لوٹا، مصلا اور سفری بستر ٹھونس کر سو مسافروں کی گنجائش رکھنے والی اس بے چاری ٹرین کی جالی، کھڑکی اور چھت پر بھی بیک وقت پانچ پانچ سو سوار ہو کر روحانی اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔۔۔

اور آپ سنائیں، آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ کہیں آپ بھی کوئی مولانا، مفتی یا امیر تو نہیں؟ نہیں نا۔ تو پھر آپ کی بھی کم بختی آئی! بہتر ہے کہ گھر کے آئینے میں گلا پھاڑ پھاڑ کے گھنٹہ بھر سانس لئے بغیر مسلسل بولنے کی پریکٹس کریں تا کہ ٹی وی شو میں آپ مخالف فریق کو بولنے کا موقع دیئے بنا اپنی ذات اور مسلک کو سچا اور جنتی ثابت کر سکیں ورنہ کسی روز مذہب کے متوالے کافر کافر کہہ کے ذبح کر ڈالیں گے اور منوں مٹی تلے پڑے پڑے آپ بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر گنگناتے رہیں گے ۔

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، سارے فساد کی جڑ اس کافر نیوٹن کے مجسمے کو نظر انداز کرتے ہوئے چلتے ہیں لائبریری کے اندر!

برٹش لائبریری برطانیہ کی قومی لائبریری سمجھی جاتی ہے جس کا افتتاح یکم جولائی ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ گھبرائیے نہیں یہاں بھی داخلہ اور تمام کتب سے استفادہ مفت میں میسر ہے، کوئی فیس نہیں مفت میں علم کے سمندر میں غوطہ زن ہو!

یہاں یو کے اور آئر لینڈ میں چھپنے والی ہر کتاب موجود ہے۔
یہاں دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ایک سو پچاس ملین کتب کا ذخیرہ موجود ہے جس میں چینی زبان میں ہڈی پہ ہاتھ سے لکھی گئی تین ہزار سال قبل کی تحریروں کے ساتھ ساتھ آج تک کی چھپنے والی کتب، مخطوطے، نقشے، اخبارات اور رسائل سمیت دنیا کی سب سے پہلی چھپنے والی کتاب بھی موجود ہے۔اس کے آڈیو خزانے میں ۱۸۹۶ء میں ایڈیسن ویکس کے مبارک ہاتھوں سے بنے فونوگراف کی ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔یہاں بارہ سو قارئین بیک وقت سما سکتے ہیں اور آن لائن استفادہ کرنے والوں کی تعداد روزانہ کے حساب سے سولہ ہزار سے زائد ہے۔یہی نہیں بلکہ دستاویزات کی ترسیل کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی سروس بھی ہے۔یہاں ہر سال ساٹھ لاکھ محققین اپنا تحقیقی کام مکمل کرتے ہیں۔اگر اس لائبریری میں موجود چیزوں میں سے پانچ آئٹم ہر روز دیکھے جائیں تو مکمل آئٹم دیکھنے میں اسی ہزار سال سے زائد کا عرصہ درکار ہے اور آپ یہاں اسی منٹ بھی نہیں گزارنا چاہتے، چلو بھیا چلتے ہیں رائل البرٹ ہال۔

رائل البرٹ ہال اور کرسٹل پیلیس

رائل البرٹ ہال اب تک دنیا بھر کی مشہور شخصیات کو اپنے ہاں خوش آمدید کہہ چکا ہے۔یہ دراصل کلاسیکی، راک اور پاپ موسیقی کے علاوہ دیگر عالمی ایونٹس کا بھی مرکز ہے۔سال کے ۳۶۰ دنوں میں ۳۵۰ ایونٹس ہوتے ہیں۔پاکستانی اور ہندوستانی غزل گائک بھی یہاں اپنا رنگ دکھا چکے ہیں۔اس کا افتتاح ۱۸۵۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں ہوا اور اس ہال میں پانچ ہزار سے زائد خواتین و حضرات کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔
۱۸۵۱ء ہی میں ہائڈ پارک میں ایک عظیم الشان عرس مبارک منعقد ہوا۔۔۔معاف کیجئے گا قلم پھسل گیا بلکہ پھسل کے ٹانگ بھی تڑوا بیٹھا ہے، عظیم الشان شو اور ایوارڈ کی تقریب منعقد ہوئی۔ویسے عظیم الشان کا لفظ تو عرس اور جلسے جلوسوں کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے دنیا کے باقی واقعات تو للو پنجو ہی

ہیں۔اس تقریب میں ہائڈ پارک میں کاروباری نمائشوں کی غرض سے کرسٹل پیلیس کا افتتاح بھی کیا گیا، تمام دیواریں شیشے کی۔ایسی چمکتیں کہ بلب جلانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔اس دور کے دنیا کے بڑے بڑے ٹریڈ مارک اور برانڈ اپنی اپنی مصنوعات لے کر اس نمائش گاہ میں آئے مگر دشمنوں کی ایسی نظر لگی کہ ۱۹۳۶ء ایک خوفناک آگ بھڑک اٹھی اور سب جل کے راکھ ہو گیا۔آگ کے شعلے اس قدر بلند تھے کہ میلوں دور تک دیکھے گئے۔

وما علینا الالبلاغ

لندن کے شاپنگ سنٹر

لندن میں کئی بین الاقوامی معیار کے شاپنگ سنٹر موجود ہیں، جن میں سے چند ایک کی ''زیارت'' آپ کو بھی کرائے دیتے ہیں۔آکسفورڈ سٹریٹ، ''دی مال''، سٹاٹ فرڈ شاپنگ سٹی' اور ہیریڈ قابل ذکر ہیں۔سٹاٹ فرڈ تو پورا ایک شہر معلوم ہوتا ہے جہاں کی تین منزلہ عمارتوں میں بڑے بڑے پلازے ہیں جن میں دنیا کی ہر چیز خریدنے کو مل سکتی ہے شرط یہ ہے کہ جیب میں پیسہ ہو۔نہ بھی ہو تو کیا ہے۔خالی گھومنے اور ٹٹول ٹٹول کر چیزیں دیکھنے کا کوئی پیسہ نہیں۔ ہوٹلوں سے لے کر کپڑوں تک کیا کچھ نہیں یہاں۔ الیکٹرونکس بھی۔ نایاب اشیا بھی۔ کیا ارمانی اور کیا ارمان یوسف او ہو کیا ارمانی اور کیا نائیکی۔ زارا، جان لیوائس وغیرہ

وغیرہ۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مارکہ جات موجود ہیں یہاں۔ ایک چھوٹی دکان نے توجہ کھینچ لی۔ ہم تیز تیز چلتے ہوئے رک گئے اور بے ساختہ قدم اس دکان کی جانب بڑھ گئے۔ قواعد کے مطابق مسکراتے ہوئے سیلز گرل نے ایک چھوٹا سا گلاب کا پھول پیش کرتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ یہاں پر ہاتھ سے بنے پنکھے، چنگیریں اور دیگر دستی چیزیں موجود تھیں۔ ایشیا اور افریقہ سے۔ دیسی چیزیں دیکھ کے دل باغ باغ ہوگیا۔ خریدنے کا تکلف ہم نے بھی نہیں کیا۔ پھر چل نکلے ایک مہنگے شاپنگ سنٹر ہاریڈز میں۔ اندر کی دنیا ہی کچھ اور ہے۔ دلوں کی شہزادی لیڈی ڈیانا اور اس کے چاہنے والے ڈوڈی فید کا یادگار مجسمہ بھی نصب ہے۔ اور ۱۸۹۵ء سے لگا ایک مکینکل کلاک بھی اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اشیا کی قیمتیں ہیں کہ ساتویں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ ایک گھڑی پہ نظر پڑی۔ یہی کوئی پانچ لاکھ پاؤنڈ کی تھی۔ یعنی محض آٹھ کروڑ روپے کی۔ ہیں ۔۔۔ آٹھ کروڑ کی محض ایک گھڑی۔ سکول کے زمانے میں ہم تو پچیس روپے والی گھڑی پا کر پچیس بار شکر کرتے تھے۔ مگر یہاں آٹھ کروڑ والی دیکھ کر چکرا سے گئے۔ قریب تھا کہ زمین بوس ہوتے۔ پاس سے گزرتی ایک سیلز گرل نے خوش اخلاقی سے ہائے ہیلو کیا۔ ہم نے نہ صرف خود کو سنبھال لیا بلکہ یوں ظاہر کیا جیسے ابھی ابھی نہ صرف یہ گھڑی خرید لیں گے بلکہ ایک کروڑ روپے اسے بخشش بھی دے کر جائیں گے۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی ہم نے بھی نکل جانے کی ٹھان لی۔

بھئی دیکھو نا! فٹ پاتھ کے سٹالوں اور پاؤنڈ لینڈوں پہ لگی پاؤنڈ پاؤنڈ کی چیزیں کس قدر معصومیت سے پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہیں۔ ہمیں خریدو، ہمیں خریدو! اور پھر دس پاؤنڈ میں پورا تھیلا بھی تو بھر جاتا ہے۔

چلو چلو نکلیں یہاں سے ؎
یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز و مزاح ان کا سلوب بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفرنامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

ماجھے کنڈی کی پچھلی قسط میں رضا مندی حاصل کرنے کے بعد جو دوسرا بڑا اور سب سے اہم مرحلہ درپیش ہوتا ہے، وہ ہے گھر کے بزرگوں اور دیگر اہلِ خانہ سے اجازت نامہ کا حصول۔۔۔کوئی مانے یا نہ مانے، یہ مرحلہ بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہو یا نہ ہو، بات کو جھنڈے چڑھانے کے مترادف ضرور ہوتا ہے۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ میرے اس ارادے کی مخالفت میں گھر میں بالکل وہی طوفان اٹھے گا جیسا کہ سمندر میں سونامی۔۔۔کہ ہر سال کا یہی رنڈی رونا ہے۔ سیانے کہتے ہیں ''آگ لگائے گا تو انگارے ہی جگے گا۔'' اللہ اللہ۔۔۔عجب چومکھی جنگ شروع ہو جاتی ہے، کبھی بہنوں کی پلٹون آنسوؤں کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتی ہے تو کبھی ماں۔۔۔ماں بے بسی و بے چارگی اور خوف کی بندوقیں تانے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، ان سے بچتا ہوں تو ''پورے گھر والی'' جھڑکتی، کوسنے دیتی، پھنکارتی، جلتی بجھتی زہریلی باتوں کے ٹینکوں سے گولہ باری شروع کر دیتی ہے اور کچھ نہ ہو تو میری بیٹی پیار بھرے نرم گرم ملائم چھوٹے چھوٹے ہاتھ میرے چہرے پہ رکھ کر ''بابا، بابا'' اپنی طرف متوجہ کر کے میرے دل کو چیر کے رکھ دیتی ہے۔

اور اُس وقت تو سین ''پرل ہاربر'' پر جاپانی فوج کے حملے والا بن جاتا ہے جب میری ماں۔۔۔میرے لال کی الٹی ریت، ساون ماس اٹھاویں بھیت۔۔۔مجھے انتہا درجے کا معصوم فرشتہ قرار دے کر مسلسل ان کم ظرفوں بلکہ کم بختوں بلکہ جنم جلوں کو کوس رہی ہوتی ہے جنھوں نے مجھے او ''پینڈے'' ''ڈالا'' ہائے ہائے! میرا پتر تے معصوم، اے تے بیڑا غرق ہویا اس "پنڈی" (راولپنڈی) دے لوفر تے لفنگے آوارہ گرداں دا، غرق جوگے، کم نہ کاج دشمن اناج، وہلے نکاریاں دے ہتھے چڑھ گیا میرا مشوم پتر۔'' میں نے بہت سمجھایا کہ ''ماں جی! کم از کم کرنل صاحب کے بارے میں تو ایسا کچھ نہ کہیں، وہ تو بڑے ہی شریف النفس آدمی ہیں۔''

جواباً ماں جی نے از سرِ نو کرنل صاحب کی شان میں جو قصیدہ پڑھا، مجھ میں لکھنے کی تاب ہے نہ یقیناً کرنل صاحب کو سننے کا یارا ہوگا۔

اب ماں جی بیچاری کو کیا معلوم۔۔۔عین اُس وقت ان مذکورہ نامذکردہ لچوں لفنگوں، آوارہ گردوں، نکاروں کی مائیں بھی میرے بارے میں ایسے ہی خیالاتِ عالیہ کا اظہار فرما رہی ہوں گی، حالانکہ صاحبان! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ نہ تو میں ''لچا'' ہوں اور نہ ہی ''لفنگا''، ہاں آوارہ گرد ضرور ہوں اور اس کا اقراری مجرم

ہوں، لیکن صاحبو! آوارہ گردی کوئی ایسی بھی بری بات نہیں کہ ایک اچھے بھلے انسان کو"لچھا لفنگا" قرار دے دیا جائے۔یاد ش بخیر اپنے"مستنصر حسین تارڑ صاحب" بھی ایک مانے پرمنے "آوارہ گرد" ہیں، ان کو اگر کوئی "لچھا لفنگا" کہیے تو یہ کوئی شرافت ہے، کوئی مانے گا کیا؟؟۔۔۔چلیں ایک لمحے کو مان بھی لیا کہ کوئی جناب "تارڑ" صاحب کو"لچا لفنگا" مانتا ہے تو یقیناً یہ کوئی بہت بڑا "اعزاز" ایوارڈ ہی ہوگا۔ یوں تو صاحب ہمیں بھی "لچا لفنگا" کہلانے میں کوئی عار نہیں، قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔

جب ماں کی مخالفت آہستہ آہستہ دہکتا ہوا بھانبڑ بن کر انڈیا پاکستان کی مخالفت میں "میں نہ مانوں" پر جا رکتی ہے تو، میرا تو برا حال ہو جاتا ہے۔

میرا برا حال دیکھ کر ماں مزید پریشان ہو جاتی ہے اور جھک کر شفقت سے، میرے احساس شکست سے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رُندھی ہوئی آواز میں بولی "پتر دوسرے کا سندھور دیکھ کر اپنا ماتھا پھوڑنے والی بات مت کر، پتر یہ تو اُن کے لچھن ہیں جن کی رن نہ کن، تیرا تو ماشاء اللہ سے پورے کا پورا جیوندا جاگدا ٹبراے، کچھ تو سوچ ان کا کیا ہوگا، پرایا دیس، نہ جان نہ پہچان بن بلائے مہمان، اوپر سے تیری یہ معصوم سی نمانی جان، اللہ نہ کرے تجھے اوپر پہاڑوں میں کچھ ہو گیا تو۔۔۔میں تے جیوندی جاگدی مر جاواں گی پتر وے۔"

امی جان کی اِس "تو ؟" نے ایک مرتبہ میرے اندر بھی۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔مچادی۔ مجھے اندر سے ہلا کے رکھ دیا، مگر میرے جنوں نے مجھے اُبھارا اور میں چیختے ہوئے، روتے ہوئے بے بسی سے بولا"امی جی! قسمت میں کچھ ہونا لکھا ہے تو یہاں گھر کے سامنے سڑک پر آپ کی آنکھوں کے سامنے بھی ہو سکتا ہے، کون سا ہر شخص پہاڑوں میں جا کر ہی مرتا ہے۔۔۔مجھے یہاں کچھ ہو گیا تو؟؟؟"

اب کے میری "تو" نے امی جی کے اندر "تو تو" کی ایسی دھماچوکڑی مچادی کہ وہ اندر سے دہل کے رہ گئیں۔ چہرے پہ ایک رنگ آنے لگا دوسرا جانے لگا، میرے کمینے دماغ نے راحت محسوس کی کہ "نشانہ بڑا ٹھیک وجیا"۔۔۔مگر ماں بھی اوپری سے بولی "اللہ نہ کرے پتر! وہ تو پھر جو اللہ کو منظور ہوا، یہ آنچل مجھے مار کی قسم تو نہ کھا۔"

اور ساتھ ہی ماں نے typical دیسی ماؤں کا مشہور و معروف فقرہ روتے ہوئے، آنکھوں میں سے یہ موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے گراتے ہوئے، سوں سوں کرتے ناک کو اپنے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولی "وے پتر! اک گل میری یاد رکھیں، کرتوں اپنی مرضی، جے تینوں کجھ ہویا ناں تے سمجھیں ہتھی ماں نوں قبر وچ اتار دتا ای۔"

فوراً سے پہلے ایک کمینہ سا خیال میرے دماغ میں کوندا اور میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا "امی جی! پھر آپ بھی میری اک گل یاد رکھنا، اگر آپ نے بھی مجھے جانے سے روکا تو میں بھی جیوندیاں جاگدیاں مرای تے جاواں گا، سنبھالدے رہنا فیر میری زندہ لاش نوں۔" غصہ سے میں نے فرش پر پاؤں پٹخا اور کمرے سے یہ جا وہ جا۔ ماں تو جیسے بھونچکی سی رہ گئی، یکدم ہی خاموش خاموش سی ہو گئی، میں بھی خاموش ہو گیا۔

اب ایک نئی جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جذبات کو exploitation کرنے کی جنگ تھی جو کہ مائیں کبھی بھی نہیں جیت سکتیں۔ نہلے پہ دہلا پھینکتے ہوئے میں نے رات کو سر درد کا بہانہ کر کے "کھانا کھانے" سے انکار کر دیا۔۔۔ماں کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، میرے کمرے میں آئیں، پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے بولیں "اچھا پتر! تو جیتا میں ہاری، جو سوہنے رب دی رضا، اب تو کھانا کھالے، کھا میرا پتر و گرنہ سر درد اور بڑھ جائے گا، ماں صدقے، ماں واری۔"

مجھے درد تو واقعی ہو رہا تھا مگر سر میں نہیں، پیٹ میں۔۔۔بھوک کی وجہ سے۔۔۔جونہی ماں نے نوالا توڑ کر منہ میں ڈالا میرا ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔۔۔پوری پانچ روٹیاں ڈکار گیا۔۔۔ماں بھی خوش ہو گئی۔۔۔ہم بھی خوش۔۔

اب مسئلہ رہ گیا والد صاحب سے اجازت نامے کا۔۔۔اور والد صاحب کے جذبات کو ایکسپلائیٹ کرنے کا مطلب

تھا۔۔۔آجوتے مجھے مار۔۔۔۔اس صورت حال میں ہم نے یہ جنگ بھی والدہ کے کندھوں پر بندوق رکھ کر لڑنے کی ٹھانی اور سیدھے سبھاؤ ماں سے کہہ دیا ''امی جی! آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے، خود تو راضی ہوگئیں، اور ابو جان سے کہہ دیا'' جانے نہ دینا۔''

میں نے صاف صاف کہہ دیا ''ابو جان سے اجازت لے کے دینا آپ کی ہی ذمہ داری ہے وگرنہ۔۔۔''

وگرنہ کے لفظ میں بڑی تاثیر ہے، سخت سے سخت دل ماں بھی ہڑ بڑا کر دہل جاتی ہے اور میری ماں تو ہے ہی موم کی گڑیا۔۔۔انتہائی نرم دل، جو خود تو جلتی رہتی ہے مگر ہمیں اپنی روشنی اور تپش میں رکھتی ہے۔

لہٰذا اگلے ہی دن ابو جان صبح صبح ہی دوکان پر جانے لگے تو یکدم ہی گھر میں جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی۔ ابو جان جنگ عظیم دوم میں حسب توقع جرمنوں کی طرح ابتداء میں خوب خوب برسے، گرجے مگر انجامِ کار ہار مانتے ہوئے غصے سے بولے ''توں جان تے تیرا پتر جانے فیر نہ مینوں کجھ کہیں جے کجھ حرج مرج ہوگیا تے، کھسماں نوں کھاؤ، جو ماں پتر دا دل کردا اے او کرو۔''

مجھے غصے سے گھورتے ہوئے اپنا غصہ دروازے کو زور سے مار کر نکالتے ہوئے یہ جا وہ جا۔۔۔اُن کے الفاظ میرے لئے ''کھل جا سم سم'' ثابت ہوئے۔۔۔ایسے میں ماں لاڈ سے مسکراتے ہوئے بولیں۔۔۔پترا اے K2 ہے کتھے کو کرکے؟''

''اماں جی! اے ''مری'' اے ناں، اس دے پچھلے پاسے۔''

''ہلا فیر خیر اے۔'' ماں گہرے اطمنان سے بولی۔ میں اپنی کمینگی اور ماں کی سادگی پر مسکرا دیا کہ ماں مری تک ہی گئی تھی۔

باقی رہا معاملا بہنوں کی پلٹون کا تو انہیں ورچانا تو میں میرے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ ہاتھ میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ مگر مچھ کے چار یہ بڑے بڑے آنسو، اور ساتھ میں رنگ برنگے یہ سات رنگی پٹھانی سوٹوں کے لارے، لشکارے نے اُن کی دماغی رو کو بہکا دیا جس سے اُن کے آنسو خشک ہوگئے اور میرے K2 جانے کے راستے کشادہ۔

یہ بے چاری معصوم مخلوق بھول جاتی ہے کہ میں آج تک واپسی پر اُن کے لئے کبھی کوئی سوٹ نہیں لایا۔

اب رہ گیا معاملہ ''پورے گھر والی'' کا۔ چونکہ رب کی رضا سے میری کوئی ''آدھے گھر والی'' (سالی صاحبہ) نہیں ہیں جو کہ اُنہیں الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا سکے اوپر سے بقول سب رشتہ داروں کے۔۔۔تجھے تو اللہ میاں نے معصوم سی ''گاں'' دے رکھی ہے جو کہ ہر حال میں خوش رہتی ہے۔ پیکے جانے کا پیکج، ساتھ میں معمولی سی رقم کی سلامی، اور کافی حد تک ترلہ منت اور بڑے پیمانے پر۔۔۔لطائف الحلیل۔۔۔سفید جھوٹ بول بول کر۔۔۔پر کو پرندے اور پرندوں کو جھنڈ بنانے، بیشمار بے پر کی علیحدہ سے اُڑانے کے بعد جا کے مرغی قابو میں آ ہی گئی۔۔۔بس یوں سمجھ لیجئے۔۔۔بکری نے دودھ تو دیا پر مینگنیں ڈال کر۔۔۔اللہ اللہ۔

مدیرانہ نوٹ: دوستو! شکر ہے کہ عنصر صاحب کی داستانِ سفر کچھ آگے بڑھی ہے لیکن ہنوز یہ گھر کی دہلیز پار نہیں کر سکی ہے۔ آپ حضرات سے ایک دفعہ پھر التماس ہے کہ دوبارہ دعا کرنے کی تکلیف کریں کہ اگلی بار موصوف واقعی کے ٹو کے سفر پر روانہ ہو سکیں، اور اس باب میں کوئی داخلی یا خارجی سازش اُن کو اڑنگی دینے میں کامیاب نہ ہو پائے۔

عنصر شبیر صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر ''گوجرانوالہ'' سے ہے چنانچہ اسی نسبت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ بقلم خود بھی عہد جوانی میں چھوٹے موٹے پہلوان رہ چکے ہیں۔ ایم اے اکنامکس، ایم اے اردو کر چکے ہیں۔ پیدا ہی کھلاڑی ہوئے ہیں۔ قومی سطح تک فٹبال کھیلے اور کوہ پیمائی کی۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف مقامات کی ہائیک کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ''کے ٹو'' بیس کیمپ پر پہنچے اور وہاں سے ''گوندوگورولا گلیشیر'' سر کیا، تب تک چند ایک پاکستانیوں نے ہی اس درے کو عبور کیا تھا۔ مختلف ادبی تنظیموں کے رکن ہیں۔ من موجی قلمکار ہیں، تین عدد سفر نامے لکھ چکے ہیں اور جب جی چاہے چھوٹا موٹا کالم بھی لکھ مارتے ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مونچھیں ہوئیں برقعہ سے بمع کان برآمد
پولیس نے یوں کرلیا "گُل خان" برآمد

کی افسرِ تفتیش پہ انعام کی بارش
اک فاقہ زدہ سے جو ہوئے نان برآمد

دیکھے ہیں بہت ایسے بھی تشخیص کے ماہر
کھانسی سے جو کرلیتے ہیں یرقان برآمد

فتویٰ ہے محبت کے کھِلائے نہ کوئی پھول
باغوں سے کرو سنبل و ریحان برآمد

ہر سُو ہے یہی شور کہ آئے ہیں الیکشن
جمہور کرے حور سے کپتان برآمد

خوشیوں کی، حسیں خوابوں کی بڑھ جائے درآمد
ہوجائیں وطن سے جو بدعنوان برآمد

ایکسپورٹ کے میداں میں ہیں ہم سب سے انوکھے
ہر مُلک میں کرتے ہیں مسلمان برآمد

الفاظ کے کھوجی کو ہے یہ عارضہ لاحق
کرلیتا ہے کرپان سے وہ پان برآمد

ہاتھوں کو فقط رہ گئے ملتے سبھی وارث
مظہر کے جو گھر سے ہوئے دیوان برآمد

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تو چلو یوں ہی سہی خواب میں رکھی جائے
پھر بھی مرغی تو کوئی قاب میں رکھی جائے

مولوی کہتے تھے پینے میں کوئی حرج نہیں
صرف مستی نہ مئے ناب میں رکھی جائے

کالی دولت نہ چھپا کار میں گھر میں مسٹر
سب سے بہتر ہے یہ تالاب میں رکھی جائے

اے خدا ملک میں خالص ہے دوا اور نہ غذا
گر شفا رکھنی ہو زہراب میں رکھی جائے

نوکری دوسری کرنی نہ پڑے شام کے وقت
آمدن بالا ہو اور جاب میں رکھی جائے

چور سے کہتا تھا شاعر یہ پکڑ کر دیواں
شاعری میری نہ اسباب میں رکھی جائے

فیس بک پر یہ منسٹر نے دیا ہے پیغام
کچھ تو عزت مرے القاب میں رکھی جائے

اعلیٰ حکام یہ کہتے تھے سِوِل سروس کے
اب انا گوندھ کے ہر "صاب" میں رکھی جاے

اک مصنف نے وصیت کسی نقاد سے کی
مری تحریر نہ احباب میں رکھی جائے

شوق سے چشم تماشا کو کریں وا لیکن
کچھ حیا دیدۂ بیتاب میں رکھی جائے

ہر سخن فہم بدل دیتا ہے مظہر اس کو
اب عبارت مری اعراب میں رکھی جائے

تنویر پھولؔ

موسم نے مبتلا جو کیا ہے بخار میں
دیکھو! حکیم جی ہیں دوا کی قطار میں

اِن مچھروں سے کہہ دو، کہیں اور جا مریں
اِتنا لہو نہیں ہے نحیف و نزار میں

محفل میں اُن کی دیکھا رقیبوں کو، کہہ اُٹھا
کانٹے کہاں سے آگئے فصلِ بہار میں!

لیڈر پھُلا کے توند یوں بستر پہ گر پڑا
جیسے کہ شیر آیا ہو تھک کر کچھار میں

دیکھا سڑک پہ ہم نے، غلاظت کا ڈھیر تھا
مینڈک نہا رہا تھا گٹر کی پھوار میں

دیکھا جو گھر کا بل تو اچھل کر وہ گر پڑے
اِتنا کرنٹ تو نہیں بجلی کے تار میں

کر لی تھیں چار شادیاں، ملّا نے یہ کہا
حالت بری بری ہے، بٹا ہوں میں چار میں

کھائے کباب اُس نے بہاری تو یہ کہا
رہتے ہیں کیا کباب بھی سارے بہار میں؟

چہرہ گھما کے اس نے کیا دوسری طرف
واعظ کو پیتے دیکھ لیا ہم نے بار میں

شوگر کے وہ مریض ہیں پر سب اُڑا گئے
حلوہ چھپا کے رکھا تھا بیگم نے جار میں

نفرت ہے لال گوشت سے، بھاجی انھیں پسند
گوبھی کا پھول لائے سجا کر وہ ہار میں!

تنویر پھولؔ

اُس کی گلی میں ہوتی ہے ہر بار چھیڑ چھاڑ
کچھ لوگ اس میں کرتے ہیں بے کار چھیڑ چھاڑ

دولھا میاں کے پاس سے پنکھا ہٹاؤ تم
کرنے لگی ہے مکھڑے سے دستار چھیڑ چھاڑ

اوزان یوں بگڑتے ہیں، روتا ہے شعر بھی
جب شاعری سے کرتے ہیں نثّار چھیڑ چھاڑ

آواز آرہی ہے جو کھٹ کھٹاک کی
لکڑی سے کر رہا ہے وہ نجّار چھیڑ چھاڑ

اس کے پڑوس میں ہیں، بھلا کیسے سوئیں ہم
پیہم کرے ہے لوہے سے لوہار چھیڑ چھاڑ

میکے میں جا کے بسنے کی دیتی ہے دھمکیاں
سردارنی سے کرتا ہے سردار چھیڑ چھاڑ

کرتے ہو دوستی، کبھی بن جاتے ہو رقیب
اب ختم کر دو مجھ سے مرے یار! چھیڑ چھاڑ

تیّار کیا ہے بننے کو سالا؟ ترا بھائی
کیوں کر رہا ہے ہم سے وہ مکار، چھیڑ چھاڑ

اُس پر نظر پڑی تو ہوئی کیسی گدگدی!
کرتا ہے سادہ لوح سے سنسار چھیڑ چھاڑ

تالاب میں مچل کے اُچھلتی ہیں مچھلیاں
بگلا بھگت کی کرتی ہے منقار چھیڑ چھاڑ

نرمی سے ٹال دیتا ہے، ہوتے ہیں لاجواب
کرتے ہیں پھولؔ سے جو کبھی خار چھیڑ چھاڑ

منیرؔ انورؔ

بیٹھے ہیں وہ بھی بیعتِ ''خاناں'' کیے ہوئے
سر زیرِ بارِ پوششِ جاناں کیے ہوئے

ان کی حضورِ حسن ہوئی تھی کلاس جب
سنتے رہے بغیر وہ چوں چاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں اس کو پریشان کیے ہوے

بلبل نے کل جو چھیڑی ترنم سے اک غزل
کوا بھی ہم نوا ہوا ''کاں کاں'' کیے ہوئے

اس کا رقیب سے جو ہوا کل ''ملاکھڑا''
رونے لگا وہ زور سے ہاں ہاں کیے ہوئے

سنیئے لطیفہ ہائے سیاست کہ دوستو
مدت ہوئی درد کا درماں کیے ہوئے

انورؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ ''مرغا'' پھنسا کے ہم
بیٹھے ہیں ''چائے وائے'' کا ساماں کیے ہوئے

دلشادؔ نسیم

یار نے بات کیا سنائی ہے
وہ سہیلی سے ملنے آئی ہے

بات اچھی بری نہیں ہوتی
میں نے تصدیق بھی کرائی ہے

ہے کنکشن تو پورے پورے پر
جانے کیا کوڈ وائی فائی ہے

پھر کسی بے سرے کے ہاتھوں سے
کسی سُر کی ہوئی دھلائی ہے

بات بے بات ہنس رہے ہیں وہ
نئی بتیسی آج آئی ہے

گھر معطر ہوا ہے خوشبو سے
آج بریانی جو بنائی ہے

یا خدا خیر ہو محبت کی
اس کا بھائی نرا قصائی ہے

ہاشم علی خان ہمدمؔ

فیس دیکھتا ہوں میں ، فیک سے الرجی ہے
کیسی فیک دنیا میں نیک سے الرجی ہے

خود کفیل رہنے کی عادتیں پرانی ہیں
میڈ سے الرجی تھی ، میک سے الرجی ہے

یہ منافقت ہے یا تھوڑی شوگر ہے
پیسٹری تو کھاتا ہوں ، کیک سے الرجی ہے

چائے اور لسی کا لطف کیا اٹھائیں ہم
ملک میں ملاوٹ ہے ، شیک سے الرجی ہے

ڈوبنے سے ڈرتا ہوں ، دور دور رہتا ہوں
مجھ کو شوخ آنکھوں کی لیک سے الرجی ہے

اس کے ہاتھ ڈنڈا ہے، کر ہی لے گی ٹیک اوور
مجھ سے عام بندے کو ٹیک سے الرجی ہے

جو بیاہ کے لایا تھا گھر میں نیک اختر کو
اختری کو اب ایسے نیک سے الرجی ہے

بار بار جو اس کو فار سیک کہتی ہے
اس کو اپنی بیگم کے سیک سے الرجی ہے

ایک خان شاعر نے ''خ'' کو ''کھ'' سے یوں بدلا
کھوچہ ام ہیں کھاں صاحب! ''شیکھ'' سے الرجی ہے

کیوں سفید رنگت کو داغ دار کرتی ہے
مجھ کو سرخ مہندی کے لیکھ سے الرجی ہے

میری اس الرجی کا اب علاج ہو ہمدمؔ
میں بھی وہ میاں ہوں جسے ایک سے الرجی ہے

جہانگیر نایابؔ

''اک پل میں اک صدی کا مزا ہم سے پوچھئے''
بیگم کی چٹخنی کا مزا ہم سے پوچھئے

سالی کی مُخبری کا مزا ہم سے پوچھئے
''انجام عاشقی کا مزا ہم سے پوچھئے''

جوتے ہر ایک طرز کے آتے ہیں اپنے گھر
بے سُر کی گائکی کا مزا ہم سے پوچھئے

بیوی گئی ہے مائکے چھتیس ماہ بعد
دو دن کی اس خوشی کا مزا ہم سے پوچھئے

اس کی گلی میں آگئے پٹنے کو پھر سے ہم
دانستہ خودکشی کا مزا ہم سے پوچھئے

بندوق تان دیتے ہیں سب بات بات پر
سالوں کی ہٹلری کا مزا ہم سے پوچھئے

اس کے طفیل آج نگر پارشد ہیں ہم
ہاتھوں میں ہتھکڑی کا مزا ہم سے پوچھئے

''آغاز عاشقی کا مزا آپ جانیے''
انجامِ شوہری کا مزا ہم سے پوچھئے

لوٹے مشاعرے ہیں ترنم کے زور پر
بے وزن شاعری کا مزا ہم سے پوچھئے

تڑوا کے ہاتھ لوٹے ہیں نایاب آج گھر
''توہینِ میکشی کا مزا ہم سے پوچھئے''

عبدالرحمٰن واصف

جیم کے ساتھ، کبھی قاف کبھی نون کے ساتھ
حشر کیا کر دیا ظالم مرے مضمون کے ساتھ

یہ مرا فن کہ میں گاؤں سے مکمل نکلا
اسی ٹائی اسی بش شرٹ اسی پتلون کے ساتھ

تانکا جھانکی کا علاج آج تلک مل نہ سکا
کھا چکے ہم بھی دوائیں کئی معجون کے ساتھ

تو ضرورت کے سے بھی نہیں کرتا خرچہ
سچ بتا دے ترا کیا رشتہ ہے قارون کے ساتھ

ڈیٹ پہ آئی ہے وہ سات "قیموں" کو لیے
حضرتِ قیس بھی پہنچے ہیں "پلاٹون" کے ساتھ

مسئلہ کیا ہے ترے ساتھ بتا دے مجھ کو
چپکا رہتا ہے تو ہر وقت ہی کیوں فون کے ساتھ

عبدالرحمٰن واصف

نقش ہے "وال" پہ "پک" اس لیے جا جا میری
سیلفی آ جائے پسند اس کو خدایا میری

میں محلے کے مکینوں سے کہاں واقف ہوں
فیس بک، ایمو، سکائپ ہی ہے دنیا میری

اس کی ڈی پی پہ مرا نام ہو کندہ یا رب
وہ کور فوٹو پہ لگتی ہو سراپا میری

ہم حقیقت میں تو کچھ اور ہیں لیکن نیٹ پر
میں ہوں اخلاق ترا اور تو رضیہ میری

اپنی خودساختہ دنیا میں ایتابھ ہوں میں
اور اے جان۔ بہاراں! تو ہے ریکھا میری

ایک ای میل پہ لکھے تو مجھے لو لیٹر
میری سسی، میری رادھا، ارے سیتا میری

تجھ سے شادی میں رچا سکتا نہیں ہوں پھر بھی
"لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"

گوہر رحمٰن گہر

تنگ اِس حضرت شاعر سے تو سارے ہوں گے
پاؤں محفل میں اگر خوب پسارے ہوں گے

ناقدو آؤ مرے شعر میں نکتے ڈھونڈو
جیم تنقیص کے سب بریکس تمہارے ہوں گے

عشقیہ کہتے ہیں اشعار جو ہر محفل میں
اس میں دو چار ہی مشکل سے کنوارے ہوں گے

ہم نے ازروئے مروت جو کہا چل پڑھ لے
اب بھگتنے پڑے اشعار کرارے ہوں گے

چند ابیات کسے ہم نے جو از راہِ مذاق
ہم سے گوہؔر تو خفا راج دلارے ہوں گے

گوہر رحمٰن گہر

بڑھ رہا ہے جس طرح اس کا حجم خود ساختہ
جسم کا رقبہ ہے مشکل سے قلم برداشتہ

منہ میں سونے کا چمچ لے کر جو پیدا ہو گیا
بے وجہ موٹا نہیں ناز و نعم پرداختہ

اک غبارے کی طرح پھولا ہوا اس قدر
دیکھ کر بدلیں ہمارے زیروبم بیساختہ

چند ہیں کچھ پہلواں اس کی طرح شائد یہاں
کھل گیا ہے گوشت کا جس پر کرم کا راستہ

اک نوالے میں گہؔر مرغ مسلم کھا گیا
ہضم اب تک جب نہیں اپنا قسم سے ناشتہ

ڈاکٹر عزیز فیصل

فسانے صرف منٹو کے چھپا کر
پڑھے ہے مولوی حجرے میں جا کر

میں دو سے چھ بجے ہوتا ہوں گھر پر
مجھے اس وقت میسج مت کیا کر

ضروری ہے اگر احمق شماری
تو خود کو گن کے اس کی ابتدا کر

سمجھتا ہے کم از کم خود کو ایدھی
وہ بیوہ بلبلوں کو رہ دکھا کر

زنانہ دست بیعت تھامتا ہے
وہ ڈبہ پیر سرشاری میں آ کر

ڈراتی ہے ہمیشہ ہم کو میڈم
میاں کا حالیہ فوٹو دکھا کر

بڑا شاعر ہے تو اردو ادب کا
سو اب اصلاح غالب کی کیا کر

چلا ہوں گندے نالے کی طرف میں
کسی کی یاد کا کچرا اٹھا کر

ہمیں کہتی ہے، جھولے دیجئے گا
غزل اپنی پنگوڑے میں لٹا کر

بشیراں کے لیئے یہ دل بنا ہے
ملازم، خدمتی، سرونٹ، چاکر

ڈاکٹر عزیز فیصل

آٹومیٹک یہ آرٹ ہوتا ہے
عشق فورا سٹارٹ ہوتا ہے

جس کو بیوی کہے شریف النفس
وہ بھی کتنا سمارٹ ہوتا ہے

کوسنا جان من کے شوہر کو
یہ محبت کا پارٹ ہوتا ہے

عورتیں کہہ رہی تھیں آپس میں
مولوی کا بھی ہارٹ ہوتا ہے

خاص کشتوں کے فائدے والا
کتنا ولگر سا چارٹ ہوتا ہے

محمد خلیل الرحمٰن خلیلؔ

احساس کمتری کا بھی اب دور ہو گیا
جب فائزہ کریم سے وہ خور ہو گیا

"لوٹا" ہے بار بار بدلتا ہے پارٹی
مُودا ہمارے شہر کا مشہور ہو گیا

ہوٹل بڑے پہ جس نے تھا چرغہ اُڑا لیا
برتن وہ اس کے دھونے پہ مجبور ہو گیا

تم ووٹ لے کے لوٹتے ہو شہر کی عوام
"اچھا تمہارے شہر کا دستور ہو گیا"

شاپنگ کرانے لے گیا چھ سالیوں کو جب
غصّہ مرے حضور کا کافور ہو گیا

ہاتھوں سے اپنے روڈ پہ جو مانگتا تھا لفٹ
جب چنگ چی ملی تو وہ مغرور ہو گیا

بیگم کی مار سے اسے دِکھتے ہیں سات رنگ
شاید کہ عدسہ آنکھ کا منشور ہو گیا

سن سن کے لوٹ پوٹ ہوئے سارے حاضرین
مجھ سے مزاح رنگ جو بھرپور ہو گیا

میک اپ زدہ جو آ گیا ہجڑہ یہاں خلیلؔ
ہر کوئی اس کو دیکھ کے مسحور ہو گیا

محمد خلیل الرحمٰن خلیلؔ

چھترول کرائی تھانے میں ، پھر پوچھا کہ ارماں کیسے ہیں
ہم بھول گئے سب دردِ کمر اور بولے مری جاں کیسے ہیں

لوٹوں کو خریدا کرتے تھے ،نوٹوں کی سیاست کرتے تھے
نکلے ہیں تو جا کر پوچھے کوئی اے گنجِ فروزاں کیسے ہیں؟

چرسی کو ڈرایا کتوں نے تو بھاگتے کہتا جاتا تھا
ہم شہرِ سگاں میں رہتے ہیں، اے شہرِ خموشاں کیسے ہیں؟

پہلے تو سہانے خواب ہمیں دکھلائے تھے پیئوں جی نے بہت
شادی کا ارادہ ہم نے کیا اب اس سے گریزاں کیسے ہیں؟

بیگم نے جو"ایزی لوڈ" پہ اب شوہر کا گریباں پھاڑ دیا
حیران پڑوسن پوچھتی تھی اے چاکِ گریباں کیسے ہیں؟

بیرون ممالک میں دولت حاکم نے چھپا کر رکھی کیوں؟
وہ لوگ جو"ثمر" لائے تھے انگشتِ بدنداں کیسے ہیں؟

اک دیگ پکائی حلوے کی دعوت پہ مسلماں آ پہنچے
حلوے پہ لڑائی کرتے ہوئے مہمان یہ ملاں کیسے ہیں

جب بھیک میں چھوٹا سکّہ دیا تب مانگنے والا کہنے لگا
کنجوس خلیلِ ان کاروں میں کچھ تنگئ جیباں کیسے ہیں

شوکت جمال

اُسے میں نے اپنا سنایا یہ دُکھڑا تو وہ کچھ نہ بولا
شبِ وعدۂ وصل سردی میں سکڑا، تو وہ کچھ نہ بولا

سنا تھا نئے مَے کشوں کو سلیقہ سکھاتا ہے ساقی
مگر میکدے میں مرا پاؤں اُکھڑا تو وہ کچھ نہ بولا

دُرشتی سے مانگے تھے گاڑی کے کاغذ سپاہی نے ہم سے
دیا ہاتھ میں سُرخ کاغذ کا ٹکڑا تو وہ کچھ نہ بولا

سُنی لن ترانی عدو کی مسلسل تری انجمن میں
پر اک بار جب اُس سے بولا میں رُکھڑا تو وہ کچھ نہ بولا

ستمگر مری ہاں میں ہاں ہی ملاتا رہا کل، مگر جب
کہا میں نے ''مت موڑنا مجھ سے مکھڑا'' تو وہ کچھ نہ بولا

شوکت جمال

گنتی کے دن تھے چار جو فصلِ بہار میں
''دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں''

آئے تھے پوچھنے وہ مرا حالِ زار جب
بیٹھے ہوئے رقیب بھی تھے اُن کی کار میں

محفل میں سردمہری سے آئے وہ پیش کل
تب سے پڑا ہوا ہوں میں ٹھنڈے بخار میں

پرہیزگار اُن کو سمجھتا تھا میں، مگر
''ٹھیکے'' پہ شیخ جی بھی کھڑے تھے قطار میں

اتنا ہے زور گائے کی ''رکھشا'' پہ ان دنوں
ملتا نہیں کباب بہاری، بہار میں

اسانغنی مشتاق رفیقی

امیرِ شہر کی بے چارگی دیکھی نہیں جاتی
ٹرپ میں کرسیوں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی

وہ آکر بیٹھ تو جاتے ہیں میٹنگ میں بڑے بن کر
سوالوں پر مرے اُن کی چُپی دیکھی نہیں جاتی

جو کل تک کرتا دھرتا تھے ہمارے سب اداروں کے
اب ایسی ہستیوں کی بے کسی دیکھی نہیں جاتی

بہت اسمارٹ لگتے تھے پہن کر سوٹ پھرتے تھے
اب اُن کی بے بسی بے چارگی دیکھی نہیں جاتی

کتابیں چند پڑھ کر خود کو وہ مفتی سمجھتے ہیں
خدایا ! ہم سے یہ مفتی گری دیکھی نہیں جاتی

خصم ہے مرگیا تیرا تو کیا ہم تو سلامت ہیں
قسم تیری، یہ تیری بیوگی، دیکھی نہیں جاتی

کھڑے ہیں، مسکراتے بھی ہیں وہ، جوتوں کی بارش میں
رفیقیؔ ہم سے اُن کی بے حسی دیکھی نہیں جاتی

اسانغنی مشتاق رفیقی

مجھکو جب عہدہ دلوا کر یاروں نے بدنام کیا
میں نے جھوٹا حلف اٹھا کر اُن کا کام تمام کیا

بلڈنگ پر بلڈنگ بنوالی اب کے بار ڈونیشن سے
پرسنٹیج کا کھیل چلا کر ہر افسر کو رام کیا

دین وایماں آپ سنبھالیں مجھ کو مطلب کرسی سے
کرسی کا مذہب اپنایا کب کا ترک اسلام کیا

یہ تو کرسی کا نشہ ہے ، جیون بھر نہ اُترے گا
رات گذاری کرسی پر ہی، دن کرسی پر شام کیا

اب کے الیکشن میں جتوایا ہم نے اپنے بندوں کو
یعنی خوب کمائی کر لی تب جا کر آرام کیا

شہر کے سارے عہدوں پر اب میرے طوطے بیٹھے ہیں
پھر بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو میں نے کیا کیا کام کیا؟

نوید ظفر کیانی

دیکھے سرِ راہ جو پھسلتا ہوا دیدہ
ہو جاتے ہیں گھر والی سے حالات کشیدہ

دے دعوتِ نظارہ بھی اور تاڑو بھی بولے
کیا خوب حمیدہ کے ہیں اوصافِ حمیدہ

حیرت ہے۔۔۔خضابوں سے سیاہ بال کئے ہیں
پھر بھی وہ سمجھتے ہیں مجھے عمر رسیدہ

یوں نطق و بیاں خوئے خوشامد سے ہیں چکنے
میں ہجو بھی لکھوں تو وہ بن جائے قصیدہ

کیا خوب سدھایا ہے پڑوسن نے میاں کو
آنکھیں بھی ہیں، سر بھی ہے، کمر بھی ہے خمیدہ

کیوں خلقِ خدا میرے گلے پڑنے لگی ہے
چمکا کے اگر بات بڑھا دی ہے شنیدہ

مجنوں کو تو مجبوری وحشت رہی لیکن
بی لیلیٰ کا فیشن ہے گریبان دریدہ

سسرال کا جنجال تو جھونگے میں ملا ہے
بیوی کو مگر سکۂ جاں دے کے خریدا

کہنے کو مشن رکھتا ہے بیداریٔ دیں کا
درویش کا نعرہ ہے مگر ''ماں دی سری دا''

سب جوشِ محبت نہ ہوا فرو تو کہنا
مل جائے جو قسمت سے نویدے کو نویدہ

نوید ظفر کیانی

ذکرِ شبانہ ، روز و شبانہ، کیا کہتے ہو
کر نہ دے اِک روز دوانہ، کیا کہتے ہو

خالص اُردو میں جب پورا فقرہ بولا
بول اُٹھا ہے ہر فرزانہ ''کیا کہتے ہو''

اُس کے جلوے کے حلوے پر رال کیوں ٹپکے
مہر شدہ ہے دانہ دانہ ، کیا کہتے ہو

موقع مل جائے تو ٹلتے کم کم دیکھا
ویسے بنتے ہیں مولانا، کیا کہتے ہو

وصل تو جیسے اور کہیں پر ناممکن ہو
یاد آ جائے روز کبانہ، کیا کہتے ہو

یہ ریٹائرڈ عاشق ہی بتلا سکتے ہیں
شادی تو ہے اک ہرجانہ، کیا کہتے ہو

پھر سے اُس کے گھر میں شور کی آوازیں ہیں
جھگڑا ہو گا یا دو گانا، کیا کہتے ہو

وہ نیناں منہ بولے بھائی ہیں ساقی کے
پھرلوں قسمت کا پیمانہ؟ کیا کہتے ہو؟؟

دل میں جاری رہے ہمیشہ آنا جانا
بن ویزے کے، آزادانہ ، کیا کہتے ہو

کبھی کبھی کوئی ایسی حرکت کر دیتے ہو
قبلہ لگتا ہے ننکانہ، کیا کہتے ہو

موجِ غزل میں کب سے میں اشعار کی صورت
بانٹ رہا ہوں کھنڈ مکھانہ، کیا کہتے ہو

روبینہ شاہین بیناؔ

ہر سو ہے شور، آخر ہوا کچھ نہ کچھ تو ہے
بیگم سے ٹاکرا جو رہا کچھ نہ کچھ تو ہے

بولا ہے کچھ تو ووٹر، ذرا وکھری طرز پر
مدت کے بعد جوتا چلا ، کچھ نہ کچھ تو ہے

محروم آئی فون سے یوں ہی نہیں ہوا
ابا کو اس کے سیل سے ملا ، کچھ نہ کچھ تو ہے

”گر میں نہیں تو کچھ نہیں“ بس یہ ہے نظریہ
ایسے بیانئے میں چھپا کچھ نہ کچھ تو ہے

دیکھا ہمیں تو رہ گئے کیوں گڑبڑا کے آپ
گویا ہمارے بعد ہوا کچھ نہ کچھ تو ہے

قصاب آگیا کوئی لاہور سے اِدھر
انسان بن گیا ہے گدھا کچھ نہ کچھ تو ہے

تکرار ہو رہی تھی کہ نااہل ، اہل ہے
پر بابے رحمتے نے کہا ! کچھ نہ کچھ تو ہے

دو چار طفل اور ملے ہیں جہیز میں
اس کے نکاحِ نو کا صلہ کچھ نہ کچھ تو ہے

دکھ درد کا بیاں بھی خاصا ہنسوڑ ہے
بیناؔ مزاح رنگ مرا ، کچھ نہ کچھ تو ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

مان لیجے ناں فیصلہ سرکار
جو بھی ہونا تھا ہو گیا سرکار

یہ جو پچیسویں محبت ہے
دل لگی کا ہے سلسلہ سرکار

آپ جیسے شریف اور بھی ہیں
اک ذرا صبر! حوصلہ سرکار

آپ جیسا امین کوئی نہیں
جو سنا تھا وہی ہوا سرکار

اتنے نااہل تو نہیں تھے ہم
جتنا ثابت کیا گیا سرکار

آپ کا ہوں میں جاں نثار وہی
کوئی خدمت! کوئی صلہ !سرکار

اب سیاست سے کیجئے چھٹی
کام اب کوئی دوسرا سرکار

کیوں نکالا گیا؟ سمجھ لیجے
پھر نہ کہنا کہ کیا ہوا سرکار

بن کرپشن نہ سوجھے کچھ بیناؔ
اک اِسی کا ہے آسرا سرکار

نور جمشید پوری

دل ترا اس لئے اداس ہے ناں؟
ساتھ رہنے کو آئی ساس ہے ناں؟

کل جو ملتی تھی ہم کو رشتوں میں
اب نہ باقی رہی مٹھاس ہے ناں

مار ڈالے گی اس کو دولت کی
روز جو بڑھ رہی یہ پیاس ہے ناں

پانچ بچے جنھوں نے پالے تھے
اب نہیں کوئی ان کے پاس ہے ناں؟

تن کی باریکیاں دکھاتا ہے
یہ امیروں کا جو لباس ہے ناں

امن غائب ہوا ہے اب کیونکہ
دین کی ہل رہی اساس ہے ناں؟

کھو گیا ہے جہان نور ترا
دن ہے سونا تو شب اداس ہے ناں؟

نور جمشید پوری

من کا میلا دل کا کالا سب چلتا ہے
لیڈر ہو تو کانا بہرا سب چلتا ہے

مل جائے گر مفت میں تو ہر دعوت میں
گائے بکرا مرغی مرغا سب چلتا ہے

رستہ مشکل ہوتا ہے بس غربت میں ہی
دولت ہو تو لولا لنگڑا سب چلتا ہے

ذات پات کی کس کو پرواہ لڑکے کو گر ملتے درہم
کون کھرا اب، کتنا کھوٹا، سب چلتا ہے

عیب نکالیں لڑکی میں سب لیکن لڑکا
کالا گورا چھوٹا موٹا سب چلتا ہے

پیسوں سے کب پیتے ہیں ہاں محفل میں
پیپسی کوکا لسی سوڈا سب چلتا ہے

چہرہ بھی بے نور ہوا جب گرمی برسے
پیسے سے تو اے سی پنکھا سب چلتا ہے

عرفان قادر

اے راہنماؤ! تھوڑا سا اس بات کا تو احساس کرو
اُلٹی سیدھی پالیسی سے، مت دیس کا ستیاناس کرو

ٹکرا کے اُلٹ جائیں نہ ٹرالر اور ٹرک بجری سے بھرے
موٹوں سے کہو، دائیں بائیں سے دیکھ کے روڈ کراس کرو

آزادی ہی آزادی ہے، اظہار کی سب کو آزادی
آ جاؤ شام کو ٹی وی پر، اور بیٹھ کے جو بکواس کرو

انجام ہے انڈین فلموں کا، مانے یا کوئی نا مانے
اک بچہ بولا جیون میں جو کچھ بھی کرو "ہن داس" کرو

ہے بیاہ تمھارا ہو بھی گیا، موسم آیا ہے الیکشن کا
اب دھرنے ورنے چھوڑ بھی دو، جا کر جلسے اجلاس کرو

جب چار عدد زوجائیں ہوں، اطفال ہر ایک سے درجن بھر
پھر اُس کے بعد کی فکر ہے کیا، چاہے انچاس پچاس کرو

جا جا پیپسی کے سٹال لگے، ملتے ہی نہیں پانی کے گھڑے
لائے گا کہاں سے بیس رُپے، اب کیسے بجھائے پیاس ''کرو''

ہے باری کِس کی برتن ورتن کپڑے وپڑے دھونے کی
تم شعلے فلم کا سِکّہ لے کر روز اُسی سے ٹاس کرو

اشعار کہو چاہے طرحی، عرفان بنو مت ''فیس بکی''
دیوان پرنٹ کرا بھی لو، غزلیں زیبِ قرطاس کرو

عرفان قادر

عشق میں کوئی ''لاس'' ہے گا کیا؟
کر کے رانجھا اداس ہے گا کیا؟

راستے میں ہے اک پُلس چوکی
جیب میں سو پچاس ہے گا کیا؟

اُس کی ڈگری تو ٹھیک ہے لیکن
میٹرک میں بھی پاس ہے گا کیا؟

آم جیسا وہ پلپلا چہرہ
مُنہ میں رکھتا مٹھاس ہے گا کیا؟

دیکھتا تھا سلاد کو پینڈو
آج کھانے میں گھاس ہے گا کیا؟

ٹیکس کم ہو گئے بجٹ میں پھر
کیوں؟ بعید از قیاس ہے گا کیا؟

شربتِ دید کا بھرا ہے ڈرم
لاؤ اپنا گلاس! ہے گا کیا؟

تُو ہے شاعر یا ہے سپائڈر مین
یہ مناسب لباس ہے گا کیا؟

ہاتھ میں جام ہے نہ سر پر خاک
نام کا دیوداس ہے گا کیا؟

تیری باری یا میری باری ہے
یہ الیکشن بھی ٹاس ہے گا کیا؟

محمد ایوب صابرؔ

بھکاری مت سمجھ مجھ کو خزانے کا منسٹر ہوں
میں اِس ولت کی گنگا میں نہانے کا منسٹر ہوں

ہمارے ملک میں جب لوگ خوشحالی میں جیتے تھے
کسی سے پوچھ لو میں اُس زمانے کا منسٹر ہوں

کبھی لندن پہنچتا ہوں، کبھی پیرس پہنچتا ہوں
گلہری کی طرح میں آنے جانے کا منسٹر ہوں

خزانے میں لگاتا ہوں نقب جو رات کو اکثر
کماتا کچھ نہیں میں تو گنوانے کا منسٹر ہوں

میرے دفتر میں کوئی کام بھی ہوتا نہیں پیارے
فقط باتوں سے لوگوں کو رجھانے کا منسٹر ہوں

عوام الناس کے ہونٹوں پہ میرا نام رہتا ہے
غریبو، میں تمھارا دل جلانے کا منسٹر ہوں

سنا ہے رات بھر صابرؔ کوئی لکھتا رہا نعرے
لکھے دیوار پر نعرے مٹانے کا منسٹر ہوں

ڈاکٹر منظور احمد

غنیمت کہ خود کو ہی مفرور کر دوں
کسے پاس لاؤں کسے دور کر دوں

نئے ایک فیشن کا چرچا بہت ہے
چلا آ تجھے مثلِ لنگور کر دوں

تری ہچکیاں ہی نہیں میری حاجت
تجھے چھینکنے پہ بھی مجبور کر دوں

ببر شیر باہر مگر اپنے گھر میں
کسی خوف سے خود کو دم چور کر دوں

سکوں کون سا دستِ عاجز میں آئے
تجھے کیوں کلہاڑی سے زنبور کر دوں

کرے اپنی مرضی مطابق وہ جو بھی
عبث کس لئے خود کو تنور کر دوں

اگر کوئی سیڑھی مرے ہاتھ آئے
مزیدار کھٹے وہ انگور کر دوں

فقط ایک موقع مرے ہاتھ آئے
تجھے پاؤں پڑنے پہ مجبور کر دوں

جرائمِ الفت یہ سمجھا رہا ہے
میں کالی کلوٹی کو بھی حور کر دوں

ڈکاروں کے نعرے ہوں منظور ہر سو
شکم کا پھلانا ہی دستور کر دوں

آثم پیرزادہ

ٹپکتی چھت کے تلے بیٹھ کر گزاری ہے
شبِ وصال کی بارش نے ریڑھ ماری ہے

سنا ہے عشق کا انجام خودکشی ہے مگر
بغیر موت کے مرنا بھی کام بھاری ہے

مکان آدھا کرائے پہ لے لیا اُس نے
اب اُس کے ساتھ برابر کی حصہ داری ہے

ہمارے دور میں مجنوں ہیں سینکڑوں لیکن
نہ اب وہ عشق نہ صحرا نہ آہ و زاری ہے

سکون گھر میں نہیں ہے تو کیا ہوا آثم
مصیبتوں سے تو دیرینہ رشتہ داری ہے

سید فہیم الدین

محلے میں جو خیراتاں کریں گے
تمھارے نال بھی باتاں کریں گے

ترے ابا کا ہی بس ڈر ہوئے گا
جو پُل پہ ہم ملاقاتاں کریں گے

ترے بھیا سے لڑ پاویں گے کیسے
اگر وہ use دو لاتاں کریں گے

ترے میک اپ میں لتھڑے گال جاناں
ہماری جیت کو ماتاں کریں گے

کبھی بیڑا غرق اپنا بھی یارو!
ہم اپنا آپ کے ہاتاں کریں گے

نوید صدیقی

صحنِ ہمسائی سے اب پھول تو کم آتے ہیں
گالیوں سے بھرے الفاظ کے بم آتے ہیں

تجربہ ہے کہ چلا جاتا ہے شوہر کا سکوں
ساس کے گھر میں جونہی سبز قدم آتے ہیں

آئے اور ساتھ میں بیگم کو بھی لے آئیگیوں؟
لے کے تن خواہ یوں بازار میں کم آتے ہیں

کون سسرال میں آتا ہے خوشی سے اپنی
ہم بڑھانے کے لیےرنج و الم آتے ہیں

ایک طوفانِ بلاخیز ہے چاروں جانب
کوئی جن آتا ہے یا میرے صنم آتے ہیں؟

روز اسکول میں ہوتی ہے مرمت ان کی
روز بچے مرے بادیدہ ء نم آتے ہیں

کام کرنے کو کہاں آتے ہیں دفتر،افسر
افسری کا میاں رکھنے کو بھرم آتے ہیں

یوں ہی غائب نہیں محفل سے جنابِ فیصل
ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہم آتے ہیں

صبح کے چار بجے موجِ سخن جاری ہے
یاد اس وقت ہی دنیا کے ستم آتے ہیں

جیب خالی ہو،کوئی قرض نہ دے تو اس دم
’’یاد بھولے ہوئے یاروں کے کرم آتے ہیں‘‘

نوید صدیقی

ڈھول گرچہ پھٹا ، پرانا ہے
ہم نے پھر بھی اسے بجانا ہے

نام اس کا ہے pure مردانہ
کام اس کا ہر اک زنانہ ہے

پیٹ سے سوچتے ہیں اکثر لوگ
اس کا گائیں گے جس کا کھانا ہے

سانپ بھی ہےاوراس میں سیڑھی بھی
زیست ننانوے کا خانہ ہے

جسم اتنا نحیف ہے اس کا
جس قدر شاعری توانا ہے

پوچھتی ہے وہ روز ایک سوال
’’سنیے! وہ! آج کیا پکانا ہے؟‘‘

ماحضر کیا ہے؟ پُرتکلف کیا؟
پانی ، پانی ہے، دانہ ، دانہ ہے

ماڈرن ہے وہ پرلے درجے کا
جس کا بہروپ صوفیانہ ہے

جواریے نے کہا کھلاڑی سے
’’تم کو اک شخص سے ملانا ہے‘‘

مرزا عاصی اختر

زبانِ شیریں چلائی چلا کے چلتا بنا
ادھار مانگا، وصولا، پٹا کے چلتا بنا

مزے مزے سے نہایا، نہا کے چلتا بنا
تمام پانی بہایا، بہا کے چلتا بنا

سنہرے خواب دکھائے ہیں بیمہ کرنے مجھے
پھنسایا مجھ کو فٹا فٹ، پھنسا کے چلتا بنا

عجیب عاشق کاذب تھا بھانڈہ وہ جس نے
جفا کا ڈھول بجایا، بجا کے چلتا بنا

سنا تھا پرسہ کرے گا پسر کا پر اس نے
ہمارا پرس اُڑایا، اُڑا کے چلتا بنا

ستم شعار نے عاصیؔ کی اِک غزل نہ سنی
بس اپنے شعر سنائے، سنا کے چلتا بنا

مرزا عاصی اختر

عاشقی کا یہ شاخسانہ ہوا
آج کی شب مقام تھانہ ہوا

تیر محبوب نے جو برسائے
کوئی اندھا تو کوئی کانا ہوا

قرض لے کر کہاں گیا مقروض
جس کو دیکھے ہوئے زمانہ ہوا

عید کے سوٹ پر یہ گُل کاری
اور اس گُل کا پان کھانا ہوا

ہم نے اس کی گلی کی جھاڑو دی
کام ہم سے یہ مہترانہ ہوا

سود پر نوٹ جب لیے عاصیؔ
یہ کھنڈر تب ہی آشیانہ ہوا

عنبر شبیر

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی

ہاتھ بوتھے پہ دیا اور یہ ارشاد کیا
جا ہر اک کھونٹے سے ہم نے تجھے، آزاد کیا

کیا کریں شکوہ جنہیں کٹ سرِ بازار لگی
اُن کی حرمت کو ترے ویر نے برباد کیا

ہم کو چوٹوں نے کبھی چین سے سونے نہ دیا
جب تجھے یاد کیا درد نے بھی یاد کیا

اِتنا مانوس تیرے پیو سے ہوں، جب بھی چھینکا
دوڑ کر پوچھا کہ کیا مجھ سے کچھ ارشاد کیا؟

مجھ کو لکھ ہوش نہیں لوگ مگر کہتے ہیں
اُس ستمگار نے مجھ پر بڑا بیداد کیا

جو میکدے میں آگئے مذاق ہی مذاق میں
وہ خُم پہ خُم چڑھا گئے مذاق ہی مذاق میں

پتہ چلا کہ شیخ جی نہیں تھے، محتسب تھے وہ
وہ کیا ہیں یہ بتاگئے مذاق ہی مذاق میں

تھے جتنے رند سن کے یہ حواس باختہ ہوئے
وہ خونِ دل جَلا گئے مذاق ہی مذاق میں

نظام میکدے کا اُن کے ہاتھ میں ہے جان لیں
وہ حکم یہ چَلا گئے مذاق ہی مذاق میں

کبھی رہیں نہ تشنہ لب، یہ کہہ کے اپنی راہ لی
وہ موج میں جب آگئے مذاق ہی مذاق میں

شرابِ ناب ہے عزیز ان کو اپنی جان سے
سبھی کو یہ بتا گئے مذاق ہی مذاق میں

مُرادِ دل جو مِل گئی ہنسی خوشی چلے گئے
جو چاہتے تھے پاگئے مذاق ہی مذاق میں

ہماری راہ ہے الگ تمہاری راہ ہے الگ
یہ فیصلہ سنا گئے مذاق ہی مذاق میں

یہ شاعری نہیں ہے اپنے عہد کا ہے تجزیہ
جو آج ہم بتا گئے مذاق ہی مذاق میں

یہ ''ارمغان ابتسام'' نے کہا کہ کچھ لکھوں
رُلا کے ہم ہنسا گئے مذاق ہی مذاق میں

زندگی مزے سے گزر رہی تھی اور محسوس ہی نہ ہوتا کہ آنے والا دن عید کا ہے، یا گزری رات شبِ برأت تھی۔ عیش کوشی کے تمام لوازمات موجود تھے۔ خالہ نے اپنی تمام توجہ اور محبت کا مرکز خالو کو مان لیا تھا۔ شروع شروع میں تو سب کچھ رومان پرور اور ہیجان خیز تھا اور شروع شروع کے بعد بھی ویسے کا ویسا رہا۔ معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، مگر احساسات بدلنے لگے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ دھیرے دھیرے اُنہیں لگنے لگا تھا کہ کچھ ایسا ہے جو کہ نارمل نہیں ہے۔ خالہ کو یک دم کسی کمی کا احساس ہونے لگا۔ پھر اِس مبہم احساس نے اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اپنی موجودگی کو محسوس کرانا شروع کر دیا۔ خالہ نے خالو سے ایک انوکھی فرمائش شروع کر دی، جو کہ خالو کے لذّتِ کام و دہن میں رکاوٹ بننے لگی تھی۔ خالو اُسے پورا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ خالہ کے مائکے والے اگر رئیس نہ تھے، تو گئے گزرے بھی نہ تھے، کوئی ایسا شوق نہ تھا کہ جو پورا نہ کیا گیا ہو۔ کوئی تمنا اور آرزو نہ تھی جو کہ حصول کے عمل سے نہ گزری ہوئی ہو، مگر کوکھ سونی رہے تو بھلا عورت بھی مکمل ہوتی ہے۔ ایک جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے کھلونے کی چاہ اُن کو اُداس رکھنے لگی۔ یہ سچ ہے کہ مرد کا ساتھ عورت کے ادھورے پن کو ختم کرتا ہے، مگر عورت کی تکمیل صرف تخلیق کے کرب سے گزر کر ہی ہوتی ہے۔ قدموں کے تلے جنت نہ فرشتوں کا اور نہ ہی مرد کا، بلکہ صرف اور صرف ماں ہی کا اعزاز ہے، استحقاق ہے، مقدر ہے۔

خالو کو اَب خالہ کی یہ بے تان کی بھیرویں بہت گراں گزرنے لگی۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے بمباٹ ٹھرّے کی بوتل ختم ہوتے ہی بڑا سا رَس بھرا لیموں معدے میں اُتار کر خوب نچوڑ دیا ہو۔

ایک دن کسی دوست سے کہا ”پتا نہیں، سالی کو آج کل بچے پیدا کرنے کا مسخرہ پن کیوں سوجھ رہا ہے، زندگی حرام کر دی ہے۔ حد ہے کہ جب نشاط سر چڑھ کر بول رہا ہو تو یہ باؤلی بچہ بچہ کی بھیرویں بکواس شروع کر دیتی ہے۔ اپنی تو یہ کیفیت ہو جاتی ہے، جیسے کہ بیچ چڑھائی پر گاڑی کا پیٹرول ختم ہو جائے! لگتا ہے مڈ ٹرم سلیکشن کر کے قائدِ ایوان بدلنا ہی پڑے گا، بھائی میاں! اپنی یہ گھریلو اسمبلی کی بانی رکن لائف ٹائم اَچیومنٹ ایوارڈ نہ لے سکے

گی''۔

خالو نے تو جوانی کی چٹکی کو چھو لیا تھا اور خالہ نوجوانی کی حدود سے نکل کر بھرپور جوانی کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں۔ جیون ساتھی سے اُن کا تصوّر شوہر کے روپ میں ایسا ساتھی تھا، جو زمانے کی تکالیف اور زندگی کی مشکل شاہراہ پر محافظ اور مضبوط سہارا ثابت ہو، پر خالو کو یہ باریکیاں اور نزاکتیں کہاں سمجھ آتیں۔ ایک اچھی لگی بندھی نوکری اور اِس پر اندرونِ صوبہ واقع زمینوں سے ہر سال وافر مقدار میں فصل کی رقم اُن کے اللّے تللّے پورے کرنے کے لیے کافی سے بھی زیادہ تھے۔ بے چاری خالہ نے جس پہلے مرد کو محبوب کے روپ میں دیکھا، وہی شوہر بھی ثابت ہوا کہ اِس سے پہلے نہ کبھی کوئی تھا اور نہ آگے کوئی ہوگا۔ مشرق کی مٹی سے ڈھلی اور ایک روز اُسی مٹی کی چادر اُوڑھ کر سو جانے والی جنم جلی کبھی دل کا حال زباں پر نہ لا سکی۔

ویسے خالو اپنے تئیں اِن خیالات میں صریحاً غلط نہیں تھے۔ عورت کے روپ میں ماں کو ہوش سنبھالنے اور اُس کے ہوش گم ہونے تلک باپ کے ہاتھوں صرف ایک جنس کی طرح استعمال ہوتے دیکھا۔ جب بھی ماں کی طرف نظر گئی، متوّرم دیدوں اور آنسو بھری آنکھوں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ انہیں اپنی ماں کے چہرے کو کبھی غور سے دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی، شاید اِسی لیے ماں کا ہیولہ بھی تصوّر میں نہیں رہا۔ بے چاری ماں صحیح طور سے جوانی کی دہلیز بھی نہ پار کر سکی کہ خِرد و ہوش سے بیگانہ ہو گئی، مگر باپ اِس کے باوجود بھی اپنی ترنگ سے باز نہ آیا، وہ ایک دن یوں سوئی کے پھر کبھی نہ اُٹھی۔ لڑکپن گزارتے خالو کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ اچھا ہوا کہ بُرا۔ پاگل ماں کی موت بھی باپ کے پاگل پن کو ختم نہ کر سکی۔ پیسہ بہت اور عیاشی کے راستے اُس سے بھی کہیں زیادہ، باپ تو ''لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام'' کے مصداق اپنے آپ میں ہی مصروف ہی رہا۔ ان کے دل کے آبگینے ٹوٹنے کی صدا اس خاموشی میں بھی نہ سن کا، شاید سننا ہی نہ چاہتا تھا۔ سو اِسی طرح رُلتے لڑھکتے خالو بھی بلوغت کی دہلیز کے پار ہو ہی گئے، مگر اپنے اَن چاہا ہونے کا دُکھ نہ کسی سے بیان کر سکے اور نہ دھیان سے نکال سکے۔

> حکومتی سربراہ یا سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اپنے مطلب کی بات کہلوانے کے لیئے انہی چچوں کو استعمال کرتے ہیں۔ کتنا عجیب لگتا ہے کہ الیکشن سے پہلے کام نکلوانے کیلئے لیڈر اپنے ووٹروں کی چچہ گیری کرتا ہے جبکہ الیکشن جیتنے کے بعد وہی ووٹر کام نکلوانے کیلئے لیڈر کی چچہ گیری کرتا ہے۔ سیاست میں کامیاب چچہ وہی کہلاتا ہے جو ٹی وی، اخبارات کے ذریعے بڑے صاحب کا زبردست دفاع اور اُس کے سیاسی مخالفین کو زیر کرنے کا ماہر ہو۔ جو لوگ بغیر تربیت اور ٹریننگ کے چچہ گیری کرتے ہیں وہ سخت نادان ہیں کیونکہ انہی چچوں کی وجہ سے دوسرے چچے بھی بدنام ہوتے ہیں۔ خوشامد پسند سیاسی لیڈروں کے لیئے اب ضروری ہو گیا ہے کہ وہ تربیتی ورکشاپوں کے ذریعے فنِ لیڈری اور فنِ تقریر کے گُر سکھانے کے ساتھ ساتھ رموزِ چچہ گیری بھی سکھائیں ورنہ یہی چچہ گیر نہ صرف اُن کے لیئے بدنامی کا سبب بن سکتے ہیں بلکہ فنِ چچہ گیری سے ناواقفیت کی بناء پر خود بھی گڑھے میں گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔
>
> **چچہ گیری از نعیم شاہ**

خالو اپنی ماں کو ہی اس کی قابلِ رحم حالت کا ذمہ دار ٹھہرانے لگے تھے۔ وہ یقین کر بیٹھے تھے کہ ماں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی وفا شعاری اور نیکوکاری ہی اس کے لیے عمر قید مع بدترین مشقت کا باعث تھی۔ وفا، خدمت اور ایثار و نثار جیسے اظہار سے اُنہیں چڑ ہونے لگی تھی۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ چڑ کی یہی چنگاری شعلہ بن کر ایک دن خود اُن کی اپنی زندگی میں ہی آگ لگا دے گی۔ مگر وہ اِس کا ادراک نہ کر سکے اور نہ اس کے لیے تیار تھے۔ وہ اپنے آپ سے ہی شکست خوردہ تھے اور اِس پر خوش بھی۔

ممتا اور پِتا دو ایسے اجنبی احساسات تھے، جن سے خالو کو کبھی آشنائی نہ ہو سکی۔ انہوں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ جس لاپروائی اور بیگانگی کے ماحول میں اُن کی پرورش ہوئی، وہ اپنی اولاد کو اِس کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔ اُنہوں نے اپنی اِس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی اولاد کے بکھیڑے میں نہیں پڑیں گے۔ وہ اپنی بدنصیبی کا انتقام انجانے میں شاید اپنے ہی چاہنے والوں سے لینا چاہتے تھے۔

شادی کو دو سال ہو چلے تھے اور اُنہیں اب خالہ کی چیں چیں بہت بُری لگنے لگی تھی۔ شہر میں نائٹ کرکٹ کا بخار نیا نیا پھیلا تھا، جس نے نائٹ میچ ٹورنامنٹس کے روپ میں من چلوں کی پاپی چلو، یعنی موج مستی کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ خالو نے بھی کرکٹ کا روگ پال لیا او ر بطور جادوئی فنگر اسپنر پورے شہر میں مشہور ہوگئے۔ دُور دُور سے ٹیمیں اُن کو اپنی طرف سے کھیلنے کی دعوت دیتیں اور اسی بہانے وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگے۔

اِدھر خالہ تنہا جلتی بھنتی رہتیں اور پھر ایسا وقت آیا کہ اُن کی راتیں مُصلّے پر گزرنے لگیں، نئی جا نماز کی سجدے کی جگہ کثرتِ سجدہ کی وجہ سے بے رنگ ہو چلی تھی۔ وہ تو اِس پر بھی قانع تھیں کہ کاش کوئی ننھا معصوم وجود ہوتا، جس کو گود میں بھر کر کلیجے سے اُٹھتی ہُوک کو ٹھنڈا کر لیتی، مگر یہ نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔

اُن کے دل میں اولاد کی خواہش کم تو نہ ہوئی، پر عمر میں صدیوں جیسے دس سال ضرور بڑھ گئے۔ خالو پہ گزرتے زمانے اور بدلتے حالات کا کچھ اثر نہ ہوا، خالہ کی انوکھی فرمائش کے مقابل اُنہوں نے بھی اِنہیں اپنے مطالبوں کی یک نکاتی فہرست پکڑا دی۔

یہ مطالبہ جان کر خالہ نے تلخی سے سوچا، ”مرد کو صرف اپنا اور وہ بھی یہی شرعی حق کیوں یاد رہتا ہے۔“ رشتوں کے اسیر زوجین کے درمیان فاصلے تو پہلے ہی تھے، اب جدائی بھی گہری ہوتی چلی گئی۔

جس دن چاندی کا پہلا تار اُن کے بالوں میں جھلملایا، خالہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، وہ اِس بُری طرح بلکیں کہ تین سال پہلے باپ کی میّت اُٹھتے سے بھی نہ روئی تھیں۔ سامنے لگا آئینہ بھی دھندلا گیا تھا، شاید رو رہا تھا کہ اُس نے کبھی خالہ کو ہنستا کھیلتا، مسرور دیکھا تھا۔ خالہ کی زندگی کے افسانے کا خوب صورت موڑ تمام ہونے والا تھا۔ اُنہوں نے دل کے ارمانوں کی قبر پر تنہائی کی بھاری سِل رکھ کر خالو کی یک نکاتی فہرست کے مطالبے کو پورا کرتے ہوئے سوتن کی اجازت دے دی:

چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
تعارف روگ ہو جائے تو اُس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اُس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

خوشی سے پھولے نہ سماتے خالو نے عقدِ ثانی میں آٹھ پہر بھی نہ لیے اور کوٹھی میں تیسرے مکین کا اضافہ ہوگیا۔ خالو کے لیے وقت نے اُلٹی چال شروع کر دی اور خالہ کے سناٹے میں اور اضافہ ہوگیا۔ چھ مہینے پہلے بکے زرعی زمین کے ایک بڑے مربع نے اِس شادی کو فائنانس کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ تین مہینے تک تو پتا بھی نہ چلا کہ خالو کب آئے اور کب گئے۔ خالہ کو آمد و رفت کا بھلے پتا نہ چلا ہو، مگر پردے کے پیچھے کے مناظر سے خوب آگاہی تھی اور ہوتی بھی نہ کیسے کہ عشرہ پہلے وہ خود بھی اِس پری کہانی کا ایک کردار رہ چکی تھیں، مرکزی کردار۔

زمانہ بدل رہا تھا اور ساتھ خالو کے سوچنے کا انداز بھی، اب کی بار خالو کو نائٹ کرکٹ کا بخار دس مہینے میں ہی چڑھ گیا، اور اِس طرح ایک شام دونوں سوتنوں کی ملاقات ہوگئی۔ بھیگتی شام رات کی بانہوں میں کھلنے لگی تو فاصلے سمٹنے لگے۔ یہ فاصلے مٹے تو لب کھلے اور لبوں کے ساتھ حالات کے گتھم گتھا پیچ بھی کھلنے لگے۔ دونوں عورتیں ایک دوسرے کا آئینہ ثابت ہوئیں۔ کربِ نسواں کی گتھی سلجھنے لگی تھی۔ اُن کی شکل و صورت میں بھلے کوئی مماثلت نہ ہو، پر عورت ہونے کا دُکھ دونوں کا یکساں تھا۔

شفیق زادہ کراچی کے ایک علم دوست گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ طنز و مزاح و فکشنل تھرلر کے دشت کے سیاح ہیں۔ قلم کو آنکس کی طرح استعمال کر کے ہنسانے اور رُلانے کا فن جانتے ہیں۔ اِن کی پہلوٹھی کی کتاب ”ہم تماشا“ فکاہیہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ”پیارے میاں“ کے کردار کے خالق شفیق زادہ روٹی، روزگار اور روزی یعنی بھابی کے لئے پردیس میں بسے ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ ”ارمغانِ ابتسام“ کے لئے ایک شاندار اضافہ ہیں۔

حافظ مظفر محسنؔ

پانچ کروڑ لے لو!

مجھ پر خوف طاری تھا لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش تھی اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کا موڈ دروازے پر لگنے والی چار گولیوں کے بعد زیادہ خوش کن کیوں ہوگیا۔

اس دوران اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا ''بدر! یہ دیکھو کتنی اچھی بات کسی ادبی شخصیت نے لکھی ہے کہ رات دو بجے ایک نوجوان ''پیزا'' لینے گیا سیل مین نے بارش کے باعث بھیگے ہوئے نوجوان سے پوچھا ''بھیا کیا آپ شادی شدہ ہیں؟''

''میاں ماں تو رات دو بجے بیٹے کو آندھی بارش میں ''پیزا'' لینے بھیجنے سے رہی شادی شدہ ہی ہوں جو بیوی کے کہنے پر اس آندھی طوفان میں رات دو بجے چل پڑا۔''

مزیدار تھا۔۔۔ ایسے لطیفے چالاک عورتیں آج کل کے مردوں کو سناتی ہیں تا کہ ''مرد'' عورت کی انگلیوں پر ناچتا رہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں بھٹی صاحب! اُن کی بیگم اگر اُنھیں ''بھٹی صاحب'' کہہ کر ایک بار بلائے تو بیچارا ''بھٹی'' نو دفعہ آیا جی۔۔۔ آیا جی۔۔۔ کرتا ہے آج بھی اس معاشرے میں فرمانبردار ''مرد'' وافر مقدار میں موجود ہیں۔ میری اس بات پر اُس نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور جلدی سے اُٹھ کر اپنا فون پکڑ لائی۔

ایک دم زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں وہ تقریباً چیخ چیخ کر کسی کو ڈرا رہی تھی ''مجھے تو لگتا ہے یہ سب تیری ہی کارستانی ہے ورنہ کسی میں جرأت ہے کہ وہ خان کی بیٹی کے مین گیٹ پر چار گولیاں برسائے اور پھر بھاگ نکلے۔''

اُس نے فون بند کر دیا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

''اب آئے گا مزا'' اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے خود کلامی کی۔

''اصل میں بدر جب سے میں نے یہ بیکار سی فلم ''عید اُدھوری'' بنائی ہے میری کچھ لوگوں سے نا چاہتے ہوئے بھی دشمنی سی شروع ہوگئی ہے یہ پروین حرامزادی اُن میں سب سے نمایاں ہے اور اس کا علاج صرف اور صرف میرے پاس ہے۔ جن تین بیٹوں پر یہ ناز کرتی ہے میں اُن کی چمڑی اُدھیڑ دوں گی۔۔۔ دس دس ہزار دیتی جاؤں گی اور تھانے میں ایک ایک ''پانجا'' لگواتی جاؤں گی۔ میرے دوست حوالدار قاسم کا لگا ہوا ایک ''پانجا'' بندے کو ایک مہینہ اُٹھنے نہیں دیتا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

''تو کیا آپ نے کوئی نئی فلم بنائی تھی؟''

''بتا تو رہی ہوں یہ کوئی دو سال پہلے میں نے اس نئے

پروجیکٹ پر کام شروع کیا تھا اور اس میں سارا کام کراچی میں ہونا تھا۔ یہ کوئی چار پانچ کروڑ کا منصوبہ تھا۔" یہ فقرہ بولتے ہوئے اُس کی ہنسی نکل گئی۔

اس دوران دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی اور دو گاڑیاں رُک کر اِدھر اُدھر مڑنے لگی۔۔۔ پولیس کا سائرن بھی بج رہا تھا۔

"یہ سامنے FIA والے کی جو بیوہ رہتی ہے وہ جینے نہیں دیتی، محلے میں چڑی اور کبوتر بھی الجھ پڑیں تو وہ 15 پر کال چلا دیتی ہے۔ جب سے "ڈولفن پولیس" آئی ہے، یہ ہر دوسرے دن محلے میں تماشہ لگائے رکھتی ہے اور کسی نہ کسی بہانے اُنھیں فون کر کے بلوا لیتی ہے۔ بدر تم اوپر جاکے بیڈروم میں آرام سے بیٹھ جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں نیچے مت آنا۔"

اس دوران سات آٹھ پولیس والے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

اس دوران فیمی کی رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں۔ پولیس والے اُسے چپ کرا رہے تھے اور وہ ایسے شور کر رہی تھی جیسے اُس کی جان کو بہت زیادہ خطرہ ہے اور پولیس اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہی۔ میں نے کھلی کھڑکی سے کان لگا کر سنا۔

وہ پولیس والے کو جو شاید DSP لیول کا آفسر تھا اُسے بتا رہی تھی کہ "یہ گولی جو دیوار پر لگی وہ میری ماں سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر لگی ہے اس جگہ میری والدہ اُس وقت کرسی پر بیٹھی قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہی تھی اگر گولی میری ماں کو لگ جاتی تو میں کسی کو زندہ نہ چھوڑتی۔"

اس دوران میں مزید خوفزدہ ہو گیا کہ فیمی اس قدر جھوٹ بولنے لگی ہے مجھے تو یہ حملہ دروازے پر گولیاں اور یہ سب شور و غل محض ایک ڈرامہ لگنے لگا کیونکہ اُس کی ماں تو بیس سال پہلے فوت ہو گئی تھی پھر یہ جھوٹی کہانی اُس نے کیوں تیار کی اور پولیس کو رو رو کر کیوں سنائی۔

آجکل کی عورتوں کو ٹیکنالوجی کے اس دور میں مردوں سے زیادہ لڑنے جھگڑنے کی سوجھ بوجھ پیدا ہو چکی ہے اور وہ اس قدر

> شیدی فولاد خان، جو شاہی زمانے میں دلی کے کوتوال تھے، رنگت کے بہت کالے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی شخص کسی جرم میں پکڑا گیا۔ کوتوال صاحب نے فرمایا "اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹا سوار کرو اور سارے شہر میں پھراؤ"
>
> مجرم بولا "صاحب، جو سزا چاہے دے دیجئے، یہ سزا نہ دیجئے۔"
>
> کوتوال نے پوچھا "یہ کیوں؟"
>
> جواب ملا "لوگ سمجھیں گے کہ کوتوال صاحب گدھے پر سوار ہو کر شہر کی سیر کر رہے ہیں۔"
>
> **حرف و حکایت از چراغ حسن حسرت**

خوفناک منصوبہ بندیاں کرتی ہیں کہ مرد حیران رہ جاتے ہیں پریشان ہو جاتے ہیں۔

اس دوران ایک عورت چیختی چلاتی اندر آ گئی۔

"یہی ہے وہ۔۔۔ پروین۔۔۔ جس کے بیٹوں پر مجھے شک ہے۔ اس کا بیٹا نادر پولیس کا ٹاؤٹ ہے اور وہ بہت سے مقدمات میں پولیس کو مطلوب بھی ہے خاص طور پر انسانی اسمگلنگ کے کئی کیس لاہور، گجرات اور اسلام آباد میں نادر کے خلاف درج ہیں۔"

"یہ عورت بکواس کرتی ہے۔ میرا بیٹا نادر تو معذور بچوں کی ایک تنظیم کا سینئر نائب صدر ہے اور وہ فلاحی کاموں کی وجہ سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب، میں نے فیمی کو ستر لاکھ روپے اپنی طرف سے اس کی بننے والی فلم "عید اُدھوری" کے لیے دے رکھے ہیں۔۔۔ نہ تو وہ فلم مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی یہ بدبخت میرے پیسے واپس کرتی ہے۔ اس نے بیسیوں لوگوں سے پیسے بٹورے ہوئے ہیں اور وہ بیچارے اس کے پیچھے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں نہ فلم بنے گی نہ ہم جیسے بدقسمتوں کے پیسے ہی ملیں گے۔"

اس دوران فیمی نے اُس عورت پروین کے منہ پر پولیس کی موجودگی میں ایک تھپڑ دے مارا۔۔۔ خوب شور شرابا شروع ہو گیا۔

"آپ میرے ساتھ تھانے چلیں۔" اُس انسپکٹر نے پروین سے کہا۔

"میں کوئی تھانے سے ڈرتی ہوں لیکن یاد رکھنا یہ عورت ایک "فراڈ" ہے اور بہت جلد بہت سے لوگ اپنے پیسے نہ ملنے پر آپ

کے تھانے میں اس عورت کے خلاف رجوع کریں گے۔'' پروین نے غصے میں کہا اور پھر چابی گھماتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی۔

''اے بی بی تم ہمارے ساتھ تھانے چلو!۔۔۔پکڑو اس نادر کو بھی جو اس دوران ماں کی سپورٹ کے لیے وہاں پہنچ چکا تھا۔

''میں تو آپ کے ساتھ چلتا ہوں لیکن میری والدہ اپنی گاڑی میں تھانے آتی ہیں اور اس عورت فیمی کو بھی آپ تھانے بلوائیں۔۔۔نادر نے پولیس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے غصے سے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

گاڑیاں نادر کو لے کر روانہ ہوگئیں پیچھے پیچھے پروین بھی اپنی مرسیڈیز پر چل پڑی۔

اس دوران جب شور شرابا کم ہوا تو میں بھی نیچے آ گیا اُس کے چہرے پر بشاشت دکھائی دے رہی تھی جیسے اُس نے کوئی معرکہ مار لیا ہو۔

''آؤ کچھ کھاتے ہیں۔'' اُس نے مجھے اشارے سے اندر جاتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب کل ایک بمباسٹک قسم کا کالم تو لکھیں۔ آج میرے گھر کچھ جرائم پیشہ لوگوں نے دن دیہاڑے کلاشن کوپ سے فائرنگ کی، میں اور میری ماں خوش قسمتی سے بچ گئے ہیں۔آپ کا شہر میں اتنا بڑا صحافی بن کے پھرنے کا کیا فائدہ جو ہم مظلوموں کی آواز ہی عوام تک نہ پہنچ پائے۔ پولیس والے اُلٹا مجھے ڈرا دھمکا کر چلے گئے ہیں اور مجھے بھی اُنھوں نے تھانے پہنچنے کا حکم دیا ہے۔۔۔ بھلا ایک عورت جس کو دن دیہاڑے قتل کرنے کی کوشش کی گئی ہو اُس کو تھانے بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اس شہر کے رسم و رواج مختلف ہیں اور پولیس اُس مظلوم کی مدد کی بجائے اُلٹا اُسے ڈراتی دھمکاتی ہے۔'' اس طرح کے فون فیمی نے کھانا کھاتے ہوئے کئی لوگوں کو کر ڈالے اور اس دوران وہ پوری طرح مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

پھر اچانک فون کی گھنٹی بجی تو وہ پریشان ہوگئی اُس نے بتایا کہ میں آج تھانے نہیں آ سکتی ایک تو گھر میں کوئی مرد نہیں ہے دوسرا میں سمجھتی ہوں کہ میرا گھر سے باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔

پہلا موقع تھا کہ میں نے فیمی کو تھوڑا پریشان دیکھا۔وہ بار بار ''نہیں نہیں۔۔۔ایسا کچھ بھی نہیں ہے، یہ سب پروین کی جعل سازی ہے ورنہ اگر میں نے اُس کے اور ڈیفنس کے بڑے پراپرٹی ڈیلر کریم داد کے اتنے زیادہ پیسے دینے ہوتے تو وہ تھانے میں میرے خلاف کوئی رپٹ وغیرہ درج کیوں نہ کرواتے چونکہ اب وہ اپنے کیے پر پریشان ہیں اس لیے وہ اُلٹا مجھے پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔''

فون بند ہوتے ہی اُس نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے تیز تیز اور نہایت سنجیدہ انداز میں کہا ''بدر تمھیں پچیس تیس لاکھ کا انتظام فوری طور پر کرنا ہوگا۔۔۔ ویسے تو ایسے موقع پر تم میرے بہت کم ہی کام آتے ہو لیکن یہ ایک ایمرجنسی ہے اور یہ پروین اور کریم داد پراپرٹی والا اپنے تعلقات اور پیسہ لگا کر کسی چکر میں مجھے نہ پھنسا دیں اس وقت تمھیں میرے ساتھ ہر حال میں کھڑا ہونا ہو گا۔''

''لیکن فیمی وہ جو پیسے ایک کروڑ روپیہ تمہاری جیب میں ابھی تک پڑا ہے وہ بھلا کس مرض کی دوا ہے۔''

وہ چیخنے چلانے لگی ''تو تم کس مرض کی دوا ہو؟''

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے ان کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں ان کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری ان کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

کالم گلوچ

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بچپن میں پڑھتے رہے تھے کہ دن کمائی کرنے اور رات نیند بھرنے کیلئے بنائی گئی ہے اس وقت ہمیں کیا پتا تھا کہ عملی زندگی میں آکر اس کے الٹ چلنا پڑے گا پتا نہیں کس کی بد دعا لگ گئی تھی کہ ہم نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا آغاز میں تو کچھ بچت ہوگئی تھی ہم اخبار کے بیورو آفس سے بطور رپورٹر منسلک ہوئے تھے اور شام کے وقت خبریں لاہور بھجوا کر دفتر سے چھٹی کر جاتے تھے اور رات گیارہ بجے تک سو جایا کرتے تھے لیکن پھر شامت نے مارا تو ہم فیصل آباد سے لاہور آکر اخبار کے نیوز روم سے وابستہ ہوگئے تھے یہاں اپنا گھر تو موجود نہ تھا اس لئے دفتر میں نائٹ ڈیوٹی کے بعد رات گئے پریس کلب چلے جاتے رہے اور وہاں سے علی الصبح بلکہ دن چڑھے ہاسٹل کے فلیٹ پر پہنچ کر سو جاتے رہے، دن کے وقت سونے سے خواب بھی نہیں آتے اور وقفے وقفے سے آنکھ بھی کھل جایا کرتی ہے کروٹیں بدل بدل کر کمر دکھنے لگتی ہے اور دوپہر کے وقت بستر چھوڑنے کے بعد بھی نیند آنکھوں میں باقی رہتی ہے، دفتر میں ڈیوٹی کے دوران بھی نیند کے جھونکے آتے رہتے ہیں۔

اسی کشمکش میں گزرتے ہیں میرے شب و روز
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

رات کے وقت جاگنے اور دن کے وقت سونے کے ساتھ ساتھ بروقت کھانا نہ کھانے اور کھانا کھا کر نیوز ڈیسک پر ہی بیٹھے رہنے سے ہم نائٹ ڈیوٹی کرنے والے صحافیوں کے معدے بھی چوپٹ رہتے ہیں، نیوز روم میں کام کے دوران تھوڑی دیر کھانے کا وقفہ کرتے ہیں اور پھر کولہو کے بیل کی طرح دوبارہ کام میں جت جاتے ہیں سیر کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا بلکہ اس قدر سست ہو جاتے ہیں کہ چہل قدمی کو بھی جی نہیں چاہتا لہٰذا غذا معدے میں پہنچنے کے بجائے خوراک کی نالیوں میں ہی اٹکی رہتی ہے جس سے نیوز روم کے بیشتر صحافیوں کو بدہضمی کی شکایت رہتی ہے انہیں کھٹے ڈکار آتے رہتے ہیں اور بالآخر ان کے جسم کا نظام انہظام ہی تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

صحافت میں جدت آنے کے باعث اب زیادہ تر اخباری اداروں میں کمپیوٹرز پر کام کیا جاتا ہے اور کمپیوٹر کی سکرین نہ صرف اعصاب بلکہ بینائی کو بھی شدید متاثر کرتی ہے صحافیوں کو بہت جلد نظر کا چشمہ لگوانا پڑتا ہے کمپیوٹر پر کام کرنے سے بھی معدے پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں دماغ بھی جلد تھک جاتا ہے اور اعصاب پرسکون ہونے تک نیند بھی نہیں آتی ہم خود رات گئے اخبار کی آخری کاپی پریس میں بھوانے کے بعد پریس کلب چلے جاتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد دوست احباب کے ساتھ گپ شپ کرتے یا کلب لائبریری میں لکھتے پڑھتے رہتے ہیں اور اعصاب پرسکون ہونے پر دن چڑھے فلیٹ پر جا کر سو جاتے ہیں ،کمپیوٹر پر کام شروع کرنے سے پہلے ہم اس قدر ذہنی و جسمانی تھکاوٹ کا شکار نہیں ہوتے تھے اور نیند بھی جلد آجایا کرتی تھی اب تو لوریاں سن کر بھی نہیں آتی البتہ پکے راگ سننے سے اعصاب کو سکون ملتا ہے ہم جب نائٹ ڈیوٹی کے بعد جب کبھی زیادہ ہی ذہنی و جسمانی تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں تو پریس کلب لائبریری میں اخبارات کے ادارتی صفحات پڑھنے کے بجائے موبائل کے میوزک پلیئر پر کلاسیکی موسیقی سننا یا سیلفی بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

صحافیوں کی نیند اڑانے میں چائے اور سگریٹ بھی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں چائے تو صحافیوں کیلئے پٹرول کا کام دیتی ہے انہیں چاہے کھانے کو کچھ نہ ملے یہ چائے پر گھنٹوں گزارہ کرسکتے ہیں بار بار چائے پیتے ہیں اور بڑی کڑک قسم کی چائے پیتے ہیں اس معاملے میں صرف ٹرک ڈرائیورز ہی صحافیوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں بلکہ ٹرک ڈرائیورز بھی صرف تمبا کو اور چائے پینے میں ہی صحافیوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں صحافی تو اور بھی بہت کچھ پیتے پلاتے اور ڈگمگاتے رہتے ہیں، ٹرک اور بس ڈرائیورز چائے اور سگریٹ کے علاوہ کچھ اور پی کر ڈرائیونگ نہیں سکتے البتہ صحافی سب کچھ پی کر اپنا کام کرسکتے ہیں، چائے اور تمبا کو نوشی صحافیوں کا شروع ہی سے پسندیدہ مشغلہ رہا ہے بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کے زمانے میں بھی صحافی ان دونوں کے بغیر کام نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے دور میں تو صحافی چائے سے زیادہ دارو اور سگریٹ کی جگہ حقہ یا بیڑی پیا کرتے تھے مولانا ظفر علی خاں دارو کو حرام سمجھتے تھے اور صرف چائے اور حقہ پیا کرتے تھے وہ چائے پی کر ایماں تازہ کرنے ساتھ ساتھ حقہ پی کر سکھوں کے دھوئیں اڑایا کرتے تھے انہوں نے اپنے اخبار روزنامہ زمیندار کیلئے ''چائے کا گھونٹ اور حقے کا کش'' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی تھی جس کے دو اشعار ہمیں یاد رہ گئے ہیں ۔

مے اگر حرام ہے چائے تو حلال ہے
دور چاء کا چلے فصلِ برشگال ہے
حقہ پی رہا ہوں میں، پی کے جی رہا ہوں میں
جس میں جی رہا ہوں میں عالمِ مثال ہے

بابائے صحافت کی روایات کو صحافی آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جدت پیدا کر لی ہے وہ چائے کے ساتھ حقے کی جگہ سگریٹ پیا کرتے ہیں اخبارات کا کوئی شعبہ ان کی ''سگریٹ گردی'' سے محفوظ نہیں ہوتا، نیوز روم میں تو ہر وقت دھوئیں کے بادل ہی چھائے رہتے ہیں، ہم جیسے نان سموکرز بھی سگریٹ کی ''دھونی'' لے رہے ہوتے ہیں انسانی حقوق کے بڑے بڑے علمبردار صحافی بھی سگریٹ پیتے ہوئے نان سموکرز کے حقوق کا خیال نہیں کرتے ان نان سموکرز میں سے بہت سے ہم جیسے دل کے مریض بھی ہوتے ہیں جن کیلئے سگریٹ کے دھوئیں میں شامل نکوٹین میٹھا زہر ثابت ہوتی ہے، سگریٹ نوش تو اپنا دُخانی شوق پورا کر لیتے ہیں لیکن اس کے انتہائی مضر اثرات سے متاثرہ صحافی دل اور پھیپھڑوں کے امراض کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

اخبارات کے دفاتر میں پہلے نیوز روم، کمپیوٹر سیکشن اور پیج میکنگ سیکشن الگ الگ ہوتے تھے کمپیوٹر سیکشن میں سگریٹ نوشی پر پابندی عائد ہوتی تھی کمپیوٹر آپریٹرز کی زیادہ تر تعداد سگریٹ پیتی تھی اور وہ جرمانے سے بچنے کیلئے بہانے بہانے سے باہر جا کر سگریٹ پیا کرتے تھے جبکہ نیوز روم میں سب ایڈیٹرز کو سگریٹ نوشی کی اجازت ہوا کرتی تھی مگر پینے والے کم تعداد میں ہوتے تھے البتہ نہ پینے والوں کو بھی ساتھیوں کی چھوڑی ہوئی کاربن ڈائی آکسائیڈ برداشت کرنا پڑتی تھی اب بہت سے پرانے اخبارات نے کمپیوٹر آپریٹرز اور پیج میکرز کو بھی نیوز روم میں لا بٹھایا ہے لہٰذا اب نیوز روم میں صحافیوں کے مقابلے میں کمپیوٹر آپریٹرز زیادہ سگریٹ پیتے ہیں، سگریٹ پینے والے اکثر سب ایڈیٹرز اور کمپیوٹر آپریٹرز سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ سگریٹ پی رہے ہیں حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہوتی ہے سگریٹ خود انہیں پی رہی ہوتی ہے ان میں سے بیشتر کی قسمت میں ساری عمر انگارے پر سلگنا لکھا ہوتا ہے، کھانسی اور بے خوابی کے مریض یہ قسمت کے مارے آخری سانس تک سگریٹ نوشی ترک نہیں کرسکتے بقول فلمی شاعر ۔

بیتی عمریا جلتے جلتے ، جلتے انگاروں پہ چلتے
موت کی منزل مل جائے تو ہو جائے چھٹکارا

میم سین بٹ یا محمد سرفراز بٹ صاحب صحافت سے وابستہ ہیں۔ روزنامہ ''جناح'' میں ہائیڈ پارک'' کے عنوان سے کالم لکھتے تھے، اب کسی اور اخبار سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ غالبًا اس کی واحد وجہ یہی ہے جو اس کالم میں بیان کی گئی ہے۔ بٹ صاحب نے لاہور کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کے بیشتر کالموں میں لاہور سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' پر روزِ اوّل سے خصوصی کرم فرما رہے ہیں۔

خرم بٹ

ڈاکٹر جہاں آرا

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔۔۔وہ ڈاکٹر تھی لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کو دیکھتے ہی انسان کو وہ مرض لاحق ہو جاتا جس کا علاج صرف اسی کے پاس تھا۔ کھلتا ہوا رنگ ریشمی بال ،قدرتی کاجل بھری ہرنی جیسی آنکھیں، بھرے بھرے رسیلے ہونٹ۔ مسکراتی تو گال کے ذرا نیچے گڑھا پڑتا۔ دیکھنے والا اس گڑھے میں ایسا گرتا جیسے پاتال کی گہرائیوں میں گر گیا ہو۔ ستواں کھڑی ناک ایسی کہ جیسے اس ناک کی بدولت خاندان بھر کی ناک معاشرے میں بلند ہو گئی ہو اور اس ناک میں ہمہ وقت جھلمل کرتی نتھلی۔ جو گویا رس بھرے ہونٹوں اور ناک کے درمیان ایک محدود فاصلہ بنائے ہوئے۔ اس کے نقش و نگار تریاق کا کام بھی کرتے جب کبھی دلِ پریشاں بوجھل ہوتا تو جھٹ اسے دیکھنے بیٹھ جاتے پہلی نظر ڈالنے پر کرنٹ سا لگتا دوسری پر جسم میں سرد لہر دوڑ جاتی اور تیسری پر گرم تاثیر اور شفا ایسی کہ انسان اپنی پہلی پریشانی بھول کر ایک نئی بیماری میں مبتلا ہو جاتا۔

وہ نفسیات کی ڈاکٹر ہے۔ بلیڈ و نشتر سے چیر پھاڑ نہیں کرتی مگر آنکھوں سے دل چیر دیتی اور اگر مسکرا دیتی تو کلیجہ چھلنی۔ بند ہونٹوں سے مسکراتی اور ہونٹ کھلنے پر نہ بھی ہنسے تو کھلکھلاتی ہوئی دکھتی۔ وہ چپ رہے تو بھی احباب سن سکیں اور بولے تو رس گھولے۔ لباس کے رنگوں کا انتخاب ایسا کہ سراپا بہار ہی رہتی۔ وہ قوس قزاح جیسی۔ کپڑوں کے رنگ اس کے چہرے کے رنگوں سے بار بار ہار جاتے۔ خدوخال ایسے کہ جو عضو جہاں اور جتنا ہونا چاہیے فقط اتنا ہی۔ کاٹن کی قمیض پہنے تو ساٹن کی دکھائی دے۔ یا تو حقیقی حسن بے پرواہ یا پھر جان بوجھ کر شانِ بے نیازی بنائے رکھتی۔ سنا ہے ہزاروں نفسیاتی مریضوں نے اس کے ہاں شفا پائی لیکن اس کے مریض ہی رہے۔ عجب قاتل حسن کی مالک جس نے دیکھا مقتولین میں شامل ہوا۔

اِس قتالہ نایاب کے شوہر نامدار جتنے خوش نصیب ہیں شاید اتنے ہی پریشان حال بھی کہ زمانہ بھر اُن کی اہلیہ کو ایسی نظر سے دیکھتا کہ شاید ویسی نظر سے تو وہ اب خود بھی نہ دیکھتے۔ کہتی،''میں جہاں آرا ہوں'' ہم نے کہا کہ کبھی جہان سے بھی آراء لیں ارد گرد نگاہ تو ڈالیں سارا جہاں ہی آپ کا ہونے کو بے قرار ہے۔

ڈاکٹر اگر حد درجہ خوبصورت ہو تو کون کافر صحت یاب ہونا چاہے۔ اسی متعلق کچھ مریضوں سے بات ہوئی۔ کچھ نے کہا ''ہم تو بھلے چنگے تھے ڈاکٹر ہی وجہ مرض ہے۔'' کچھ بولے ''نفسیاتی

مسٹر دہلوی کی وضعداری کا تیسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ جب کوئے، کتاب لکھتے ہیں تو اس کے ساتھ دو تین درجن افراد میں بھی لکھنے کا شوق پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی ہر کتاب پر متعدد دیباچے ہوتے ہیں جن میں ایک ہی بات کو مختلف انداز سے ذہن نشین کرایا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ قاری ان دیباچوں کو پڑھ کر اِتنا علم حاصل کر لیتے ہیں کہ اصل کتاب پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سُن تو سہی از مشفق خواجہ

مسائل کا شکار تھے نیم پاگل تھے جناب کی عنایات وگفتار کے سبب صحت یاب ہوئے عرصہ ہوا لیکن جب سے مرض ڈاکٹر لگا دیوانے ہوئے پھرتے ہیں۔''

ہوسکتا ہے نفس کے کسی مرض کا عمر سے کوئی تعلق ہو لیکن نفسیاتی امراض عمر نہیں دیکھتے اور نہ ہی ان کے ڈاکٹر۔ اور وہ محترمہ تو خدا کی پناہ۔ ویسے تو سائنس نے اب اتنی ترقی کر لی کہ نت نئی بیماریاں وجود میں آنے لگیں ہیں۔ اللہ بھلا کرے پڑھے لکھوں کا کہ پوری دنیا میں ایک طلاطم برپا کر رکھا ہے یہ تھراپی اور وہ تھراپی۔ یہ بیماری اور وہ علاج۔ مرض کے ظہور ہونے سے پہلے ہی اس کا علاج مارکیٹ میں آجاتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس دوا کے ذریعے آپ اس مرض سے محفوظ رہیں گے، جو ہوا بھی نہیں۔ یعنی مرض کے لاحق ہونے سے پہلے علاج۔

جدید دور نے انسانی صحت اور نفسیات پر گہرا اثر ڈالا ہے .پیدل چلنے والے سائکل کے بعد موٹر سائیکل اور پھر گاڑی پر آئے۔ کمپیوٹر نے تو گویا کئی گھنٹے اکڑوں بٹھا دیا جنھیں مسواک کی عادت تھی خوش تھے ٹوتھ برش والے بے چارے اب امساک کی فکر میں جتلا رہتے۔ کمال حد ہے کہ پہلے پہل جو مالش ہوا کرتی تھی اب وہ بھی پالش کے زمرے میں آئی۔ عجب مرحلے اس وقت درپیش ہوئے جب مالش اپنوں کی بجائے پرائی عورتیں اجرت لے کر کرنے لگیں۔ ماڈرن دنیا نے اسے مساج کا نام دیا اپنوں سے کرائی گئی مالش نقطۂ سکون تک لے جاتی تھی اور اب غیروں کے یہ اُجرتی مساج نقطہ ہیجان تک پہنچاتے مگر جہاں آراء خدا نخواستہ جسمانی نہیں محض ذہنی مساج کرتی ہیں۔

علاج میں ادویات کا ستعمال کم سے کم کرواتیں۔ کہتیں ''انسان کے دماغ میں ہی اس کی ذہنی بیماریوں کا علاج پوشیدہ ہے۔''

نفسیات کا روحانیت سے گہرا تعلق ہے۔ دنیا کے تمام ماہر نفسیات مریضوں کو کسی ایک خاص نقطے کی جانب مرتکز کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں جو ظاہر ہے مذہب، عقیدے، عشق وغیرہ سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے۔

محترمہ بھی معالج ہیں۔ مریض کے علاج کے دوران اسے اس کی سوچ کے مطابق کسی نکتہ پر مرتکز کرتی ہیں۔ شفایابی منجانب اللہ لیکن ایک بات طے کہ صحت یابی کے بعد مریض باقی تمام تر ارتکاز بھول بھی جائے تو اس ڈاکٹر کو کبھی نہیں بھول پاتا۔

آج کل کے پیروں فقیروں سے متعلق سنا ہے کہ وہ سخت روحانی علاج کرتے ہیں۔ بعض کہانیوں بیانیوں کے مطابق خوبرو بے اولاد خواتین یا وہ جنھیں ساس یا نند کی ناک میں دم کرنا مقصود ہو زیادہ دم نہیں کرتے بس ایک دم کرتے ہیں یوں اپنے تیئں ''دما دم مست'' رہتے ہیں مگر جہاں آراء نفسیات کی حقیقی ڈاکٹر ہیں سو جس کو ذہنی بیماریوں کا خاتمہ کرنا مقصود ہو ضرور ان کے ہاں جائے نجات پائے مگر اپنی ذمہ داری پر کہ مرضِ عشق بیماروں کی ماں ہے۔۔ ہم تو یہی کہتے ۔۔ بقول غالب ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

بشکریہ ''ہم سب''

خرم بٹ صحافی، کالم نگار، تجزیہ کار اور بہت کچھ ہیں۔ راولپنڈی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہیں کے ایک اخبار سے وابستہ ہیں۔ اخبار میں ''بٹ۔ گمانیاں'' کے عنوان سے مختصر اور طویل ہر قسم کا کالم لکھتے ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فقرے بازی کے بادشاہ ہیں۔ خاصے شگفتہ اور بذلہ سنج و ہنسوڑ مزاج کے حامل ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' سے ان کا دیرینہ تعلق ہے جو ان کی محبت کا واضح ثبوت ہے۔

گلوبل حمد

پروفیسر عنایت علی خان

یا حافظُ امریکہ، یا ناصرُ امریکہ

ہیں تیرے ثنا خواں ہم اور تابعِ فرماں ہم
تھامے ہیں عقیدت سے عظمت کا تری پرچم
اک تو جو ہمارا ہے پھر ہم کو بھلا کیا غم
ہر دکھ کی دوا تو ہے ہر زخم کا تو مرہم
تو حافظِ کل عالم، تو ناصرِ کل عالم
امریکہ و امریکہ ہے وردِ زباں ہر دم
یا حافظُ" امریکہ، یا ناصرُ" امریکہ

دنیا میں فقط سچا اک تیرا سہارا ہے
کیا ہیں دل و جاں تجھ پر ایمان بھی وارا ہے
ہر رنج و مصیبت میں بس تجھ کو پکارا ہے
ہر دوست ترا ہم کو جی جان سے پیارا ہے
جو بھی ترا دشمن ہے دشمن وہ ہمارا ہے
تیری ہی عطاؤں پر بس اپنا گزارا ہے
یا وارثُ امریکہ، یا رازقُ امریکہ

جو تیری طلب ہو گی ہم اُس سے سوا دیں گے
اک تیرے اشارے پر ہم جان لڑا دیں گے
پیاروں کو کٹا دیں گے، خوابوں کو سُلا دیں گے
خود اپنے نشیمن کو ہم آگ لگا دیں گے
پھر آگ کے شعلوں کو ڈالر کی ہوا دیں گے
مقتل میں تہہ خنجر جینے کی دعا دیں گے
تم "خون بہا" دینا، ہم خون بہا دیں گے
یوں شانِ وفاداری دنیا کو دکھا دیں گے
یا قاہرُ امریکہ، یا غالبُ امریکہ

پتہ نہیں

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

ہیں ڈگڈگی کے ریچھ یا بندر پتہ نہیں
لے جائیں گے کہاں ہمیں رہبر پتہ نہیں

ڈنڈا چلے گا کس کا ، نکالے گا ڈنڈ کون
بیٹھے گا کون مسندِ شہ پر پتہ نہیں

گاڑی چلائے جاتے ہیں ہم طمطراق سے
ہیں ٹائروں میں چار سو پنکچر ، پتہ نہیں

آتی ہمارے حال پہ ہے شرم کو بھی شرم
کیونکر ہوئے ہیں لال ٹماٹر پتہ نہیں

ہر ایک اپنا زور دکھاتا ہے آج کل
چل دے گا کون کس کو اٹھا کر پتہ نہیں

کب کوئی بدمعاش حکومت سنبھال لے
کب جیل کو سدھارے ہنر ور پتہ نہیں

منہ کھول کر وہ بیٹھے ہیں اب ''ین'' کے واسطے
کتنے ہڑپ وہ کر گئے ڈالر پتہ نہیں

گھن چکری ہے قوم ہماری نچانے کیوں؟
چکر بھی کھائے اور دے چکر، پتہ نہیں ؟

مظہرؔ ہوئی ہے نیکی بدی مکس اس طرح
ہے خیر کس جگہ پہ کہاں شر پتہ نہیں

ککڑوں کوں

مرُغ کہنے لگا مرغی سے بصَد رنج و ملال
''اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی قابوں میں ملیں''

کیا پتا گردشِ ایّام کہاں لے جائے
جانے ہم دونوں کہاں، کون سے ''کھابوں'' میں ملیں

غوطہ زن ، ''قلزمِ یخنی'' میں بھی ہو سکتے ہیں
یہ بھی ہوسکتا ہے کل دونوں کبابوں میں ملیں

قورمہ میرا بنے ، زینتِ بریانی ہو تُو
اے خدا ہم نہ کبھی ایسے عذابوں میں ملیں

عین ممکن ہے کہ ہو فاتحہ خوانی ہم پر
خاتمہ ''ختم'' پہ ہو اور ثوابوں میں ملیں

یا کہیں مولوی صاحب کے شکم میں اِک دن
ہم کو ہو حکم کہ اب دونوں حجابوں میں ملیں

اِس سے پہلے کہ جدائی کا یہ موسم آئے
جانِ جاں آ ، اِسی دنیا کے خرابوں میں ملیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فیس بک کے پنگے

شہناز شازی

ہزاروں ''ڈیپیاں'' ایسی کہ ہر ''ڈی پی'' پہ دم نکلے
کہ جن سے فیس بک پر مجرمانہ زیر و بم نکلے
یہاں پر ''فیک آئی ڈیز'' کی بہتات ہے اتنی
کہ بندہ مر ہی جائے ایسے ایسے پیچ وخم نکلے
کبھی مس سے کوئی مسٹر، کبھی مسٹر سے مس نکلی
کبھی گل رخ کی آئی ڈی سے لالہ گل حشم نکلے
بہت ہی کنفیوژن ہے یہاں ''بیبیوں'' میں ''مشٹیوں'' میں
نعیمہ خان تھی جو بعد میں سید انعم نکلے
تذبذب نور، گل، ممتاز، انجم اور اختر میں
بدر احسان تھی جو ایک دن بدر الکرم نکلے
کبھی انجم میاں ملتے ہیں یاں انجم السحر بن کر
مسز نجمہ کے پردے میں کبھی نور انجم نکلے
کچھ ایسے بھی نمونے ہیں جو ''بہنا بہنا'' کہتے ہیں
انہیں پرکھا تو اکثر ان میں عاشق بے شرم نکلے
تھا اسٹیٹس کنوارے ہیں، ابھی کالج میں پڑھتے ہیں
جنہیں ہم ینگ سمجھتے تھے وہ سو سے کچھ ہی کم نکلے
بزرگوں کی صفوں میں جو ہمیں رکھتے تھے ہر لحظہ
ہمیں کہتے تھے جو ''آپی'' وہ آپا کے خصم نکلے
بہت سوں نے تو حد کر دی ہمیں کہنے لگے ''امی''
جنہیں بیٹا بنایا تھا وہ انکل محترم نکلے
بہت بارعب ڈی پی ہے کہ گویا ہوں فریش حاجی
کیا جب چیک انہیں، فرہاد کا دسواں جنم نکلے
کیا ہے ایڈ کل جس کو وہ کومل سی حسینہ ہے
ابھی تو پھلجھڑی ہے، بعد میں ممکن ہے بم نکلے
ادب کرتے تھے جن کا معتبر ہستی سمجھ کر ہم
جنہیں سمجھے تھے علامہ سراسر کم فہم نکلے
مسیحا جان کر جن کو سنایا تھا غمِ دوراں
جنہیں ہمدرد سمجھے تھے وہ مصروف ستم نکلے
ترنم کے بہت ان باکس میں ڈنکے بجاتے تھے
بتاتے تھے رفیع خود کو مگر سونو نگم نکلے
کیا ان فیک آئی ڈیز کو جب ''ان فرینڈ'' ہم نے
بہت کم چشم نم نکلے، زیادہ ہٹ دھرم نکلے
لگے کرنے بلاک اک فیک آئی ڈی تو وہ بولا
''بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے''

آزمودہ شوہر

محمد عارف

مجھے ماں نے جو کچھ بتایا ہوا ہے
اسے میں نے وہ سب سکھایا ہوا ہے
ہر اک کام اس سے کرایا ہوا ہے
یوں ہی تو نہیں گھر لگایا ہوا ہے
یہ شوہر مرا آزمایا ہوا ہے

میں شاپنگ پہ جاؤں یہ بچے پڑھائے
مرے آنے تک دال، سبزی بنائے
میں آٹا بناؤں یہ روٹی پکائے
تو اس نے چولھے چڑھایا ہوا ہے
یہ شوہر مرا آزمایا ہوا ہے

ذرا دیر میں دھولے دس بیس جوڑے
کوئی گھر میں گندا یہ برتن نہ چھوڑے
مری اُنگلی کے اک اشارے پہ دوڑے
اسے میں نے آگے لگایا ہوا ہے
یہ شوہر مرا آزمایا ہوا ہے

عجب اک ہوئی میراتھن شوہروں کی
تھی اپنے ہی کاندھوں پہ رَن شوہروں کی
بہت دیدنی تھی لگن شوہروں کی
یہ اس ریس میں فرسٹ آیا ہوا ہے
یہ شوہر مرا آزمایا ہوا ہے

زرینہ کے شوہر کو پیٹا تھا اس نے
ثریا کا دیور گھسیٹا تھا اس نے
کئی بار یہ فن ''رِپیٹا'' تھا اس نے
لڑائی میں اس کو لڑایا ہوا ہے
یہ شوہر مرا آزمایا ہوا ہے

مرے پہلے شوہر کے جیسا ہی مکھ ہے
نہ پہلے تھا مجھ کو نہ اب کوئی دکھ ہے
حیات اس کی سکھ ہے، ممات اس کی سکھ ہے
کہ اس نے بھی بیمہ کرایا ہوا ہے
یہ شوہر مرا آزمایا ہوا ہے

کھوتا نامہ

تنویر پھولؔ

ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا ہوں
کب میں کسی سے ڈرتا ہوں
ٹانگ پسارے سوتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

کسی کو لگتا ہوں سندر
کوئی کہے مجھ کو خچر
میں گھوڑے کا پوتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

میں امریکی رہبر ہوں
ڈیمو کریٹک لیڈر ہوں
کاٹوں گا ، جو بوتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

ظاہر میں ہوں اب ہاتھی
اندر سے ''کھوتا'' ضدی
سب کو سوئی چبھوتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

لیڈر ہوں میں ری پبلک
باتوں سے میری سب sick
سب کی ناؤ ڈبوتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

ظلم ہُوا ہے مجھ پہ بڑا
پاکستان میں کیوں ہوں پڑا
قسمت کو میں روتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

کہتی ہے میری ''کھوتی''
بھارت میں پہنو دھوتی
دھوتی کو کب دھوتا ہوں!
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

قوم کو شعر سناتا ہوں
مالا غزل کی بناتا ہوں
شعر پہ شعر پروتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

آج کی ہے یہ تازہ خبر
پھولؔ میاں کی مجھ پہ نظر
میدانوں میں ہوتا ہوں
سن لو ، میں اِک کھوتا ہوں

ایک بیچارا مزدور

عزیز فیصل

اِس کی ڈیوٹی کا بڑا ہی سخت سا شیڈول ہے
یہ فقط چوبیس گھنٹے کا ملازم ہی نہیں
اِس کے ماہ و سال میں
ہفتہ اور اتوار کی تعطیل کا کوئی تصور بھی نہیں
سر جھکائے
سردی، گرمی، دھوپ، بارش، ژالہ باری، آندھیوں میں
اس نے اپنی مالکن کے
الٹے سیدھے آرڈروں کی
جوں کی توں تعمیل ہی کرنی ہے بس
کذب۔ دل سے
اے ٹی ایم کی شاہ رگ کو کاٹ کر
سب ادھوری، بے تکی فرمائشوں کی
سر تا پا
تکمیل ہی کرنی ہے بس
اس کی مزدوری نہیں موقوف اک دو کام پر
خوب سجتے ہیں
پلمبر، مستری، ویٹر، ڈرائیور، کک، ملازم
آیا، دھوبی، پالشی، ترکھان کے اعزاز اس کے نام پر
راحت و دادو کرم سے اچھا خاصا دور ہے
یہ نہایت کام کا مزدور ہے
یاد رکھیں
کیوں نہ مزدوروں کے دن پر ہم اسے

گو سمجھتی ہے نکھٹو کلیتاً بیگم اسے
ہم سراہیں
کیوں نہ اس کی عائلی اپروچ کو
کولہو والے بیل جیسی سوچ کو
یہ ہر اک مزدور سے بہتر جو ہے
اصطلاحی اور لغوی طور پر نوکر جو ہے
شوہر جو ہے

ہمتِ مرداں

ستر برس میں ساتویں شادی جناب کی
کرتے ہیں یہ ضعیفی میں باتیں شباب کی
سر پر ہے کوئی بال نہ آنکھوں میں نور ہے
پر ساتویں نکاح کی حاجت ضرور ہے
اب بے ثمر شجر ہو تم ویران باغ ہو
سوکھا ہوا چھوارہ ہو بجھتے چراغ ہو
جنت میں راہ تکتی ہیں حوریں جناب کی
باقی بچی ہوئی ہیں اب سانسیں گنی چنی
مولیٰ کو یاد کیجئے سب بھول جائیے
اب زندگی کا کیا ہے بھروسہ بتایئے
اس پر بڑے سکون سے بولے بزرگوار
ہے بے بھروسہ زندگی کیا اس کا اعتبار
کر کے یقیں حیات کا پچھتا رہا ہوں میں
چھ بیویوں کو پہلے ہی دفنا چکا ہوں میں
چھ بیویاں مکین ہیں شہر خموش میں
لیکن کمی نہیں ہے ذرا میرے جوش میں
چھ بار دھوکا دے چکی ہے مجھ کو زندگی
میں بھی مثال غزنوی ہارا نہیں ابھی
چھ نوجوان بیویاں پہلے ہی مر چکیں
سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں
ان چھ کی طرح ساتویں بھی مر گئی اگر
کرنی پڑے گی آٹھویں شادی مجھے ڈیئر

احمد علوی

تری شان جل جلالہٗ

ہوئی خستہ بیگم سیم تن تری شان جل جلالہٗ
مجھے بخش دے کوئی گل بدن تری شان جل جلالہٗ

تو رقیب کو مرے دال دے اسے سوکھی روٹی پہ ٹال دے
مجھے روز کھلوا مٹن چکن تری شان جل جلالہٗ

میں ہوں ایک پھول کپاس کا مرا وزن کے جی پچاس کا
مری اہلیہ مگر ایک ٹن تری شان جل جلالہٗ

رکھا بکریوں کی قطار میں ملی کیا کمی مرے یار میں
دیئے کالی بھینس کو چار تھن تری شان جل جلالہٗ

بنا باپ پہلی ہی رات میں مجھے نیک بیوی کے ساتھ میں
ملے مفت بچے بھی اک ڈزن تری شان جل جلالہٗ

جنہیں تو نے بخشی ہے علمیت کریں دوسروں کی ملازمت
دیا ان پڑھوں کو اپار دھن تری شان جل جلالہٗ

مرے سامنے جو ہے اک بھون وہاں چار پانچ ہیں گل بدن
مرے گھر چڑیل ہے خیمہ زن تری شان جل جلالہٗ

مجھے شعر اس نے لکھا دیئے سر بزم میں نے سنا دیئے
یہ مرا ہنر وہ ہے تیرا فن تری شان جل جلالہٗ

احمد علوی

فیض اللہ خان آوارہ بلی ٹنگوی

وطن پر یہ احسان فرمائیں لوٹے
الیکشن نہ لڑنے کو اب آئیں لوٹے

اگر اِن میں رتی برابر ہو غیرت
تو ممبر بھی ہو کر نہ کہلائیں لوٹے

جو لوٹی ہے دولت وطن کی اِنہوں نے
وطن کو وہ فی الفور لوٹائیں لوٹے

خدارا نہ اب اِن کو تم ووٹ دینا
بدل کر نہ پھر بھیس آ جائیں لوٹے

سیاست کے نزدیک بھی اب نہ آئیں
کوئی اور ہی شغل فرمائیں لوٹے

مزا تب الیکشن کا آئے گا ہم کو
نہ بکسوں میں اک ووٹ بھی پائیں لوٹے

جو پائی ہے دولت ضمیروں کے بدلے
مزے سے وہ اب بیٹھ کر کھائیں لوٹے

لکھے اِس لئے ہیں یہ اشعار میں نے
اِنہیں پڑھ کے تھوڑا سا شرمائیں لوٹے

محمد عمران قاضی

جب میں تماشا بنا

قدیم انگلستان میں رواج تھا کہ سزائے موت کے قیدیوں کو سرِ عام پھانسی لگائی جاتی تھی۔ لوگ یہ منظر دیکھنے کے لئے ہجوم کی صورت اکھٹے ہو جاتے اور جیسے ہی پھانسی ہو جاتی ان کا تماشا ختم ہو جاتا اور وہ گھروں کو پلٹ جاتے۔ ایک بار ایک قیدی پھانسی گھاٹ لایا گیا لیکن لوگوں کے ہجوم نے راستہ یوں روکا ہوا تھا کہ اس کو پھانسی گھاٹ تک پہنچانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے با آوازِ بلند اعلان کیا۔ "دوستو! جو تماشا تم دیکھنے اکھٹے ہوئے ہو وہ میرے بغیر نہیں ہوگا۔ مجھے راستہ دو اور تماشا دیکھو" ہجوم نے راستہ دیا اور اس کا کہا پورا ہوا۔

میری ڈکشنری میں شادی بیاہ پر خود کو تماشا بنانے کے لئے پیش کرنے والا جری کام ایک دولہا کرتا ہے۔ دولہا نہ ہو تو تماشا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی عوام کے منورنجن کا بخوبی انتظام ہو سکتا ہے۔ بچہ ابھی پالنے میں ہوتا ہے تو ماں کہنا شروع کر دیتی ہے "میں اپنے بیٹے کے لئے چاندی دلہن لاؤں گی" یہ الگ بات ہے کہ دلہن لانے کے بعد وہی ماں چاند والی مائی کی طرح گلوں اور شکووں کا ایک چرخہ رکھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے

میرے والدین کو میرے لڑکپن میں ہی یقین ہو چلا تھا کہ اگر ہم نے اس لڑکے کی شادی نہ کی تو ہمارے گھر چاندی دلہن تو شاید ہی آئے کوئی "چن" ضرور چڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ حفاظتی تدابیر کے طور پر چٹ منگنی پٹ بیاہ والا فیصلہ کر لیا گیا۔ کالج اور کرکٹ کے درمیان ہنستی کھیلتی زندگی میں محسوس ہی نہ ہوا کہ گھر کی ہوائیں مخالف سمت میں چل رہی ہیں جب بات پلے پڑی تب تک پانی پلوں کے نیچے سے اور چھتوں کے اوپر سے گذر چکا تھا۔

دوستی ایسی دوائی ہے جو ہر دکھ میں کام آتی ہے۔ دوستوں سے مشورے کیے تو غالب اکثریت نے شکرانے کے نوافل پڑھنے کا مشورہ دیا کہ ہمیں تو حسرت ہی ہے اگر تمھارا کام بن رہا ہے تو کیوں کفرانِ نعمت کرتے ہو؟ مجھے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہوا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری آزادی سے جلتے ہیں چنانچہ فوری طور پر احتجاج کا منصوبہ بنایا سوچا پرانے ٹائر اکھٹے کر کے گھر کے دروازے پر جلاؤں شاید اس دھوئیں سے والدین کی آنکھوں میں آیا غبار چھٹ جائے۔ کل جیب خرچ اکھٹا کیا تو سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ بھوک ہڑتال کا فیصلہ کیا کہ گھر سے بغاوت کا

اعلان کر کے کھانا کسی دوست کے گھر سے کھانے کا انتظام کروں۔
مگر دوستوں پر اس وقت شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی انہوں نے یکسر تعاون سے انکار کر دیا۔ ابھی مزید تخریبی سوچیں زیرِ غور تھیں کہ والد صاحب نے طلب کر لیا۔

قبلہ والد صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو انتہائی دھیمے مزاج کے ہونے کے باوجود بھی انتہائی آتشی رعب داب کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والا مکالمہ کچھ یوں تھا۔

''جی برخوردار! کوئی پریشانی؟''

''نہیں ابو جی!''

''سنا ہے کہ جناب کو شادی پر کچھ اعتراض ہے۔''

''جی۔۔۔ نہیں، جی نہیں، نہیں تو جی۔''

''تمھیں بتایا تھا ناں کہ میں نے تمھاری شادی کر کے جانا ہے۔''

''میں سمجھا آپ مذاق کر رہے ہیں۔''

''الو دا پٹھا!''

''جی ابو جی!!''

(ہماری آپس کی بات چیت میں روانی میں یہ دو مختصر جملے تھے جن پر بعد میں ہم بہت ہنستے تھے۔)

''تو پھر سب ٹھیک ہے۔''

''وہ ابو جی! میری پڑھائی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔''

''سردار حمید صاحب بتا رہے تھے کہ پچھلے دو مہینے سے آپ فزکس کی کلاس اٹینڈ نہیں کر رہے۔''

''وہ ابو جی میں نے آرٹس رکھ لی ہے۔''

''حافظ شریف صاحب کہہ رہے تھے کہ ٹیوشن باقاعدگی سے آتا ہے لیکن کالج میں کبھی دیکھا نہیں۔''

''اچھا تو کب ہے؟''

''کیا کب ہے؟''

''جی میری شادی!''

ابو زیرِ لب مسکرا اٹھے اور جانے کا حکم دیا۔ مہمانان کی ایک

> برصغیر کے بعض پسماندہ علاقوں میں اب تک یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ برادری کی تمام بوڑھیاں کسی کے ہاں غمی میں شریک ہوتی ہیں تو لمبا سے گھونگھٹ کاڑھ کے بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے اپنے پیاروں کے نام لے کر بین کرتی دھاڑتی ہیں۔ سب اپنے اپنے مردوں کی خوبیاں بیان کر کے خشک آنسوؤں سے روتی ہیں۔ اگر کوئی ناواقف حال پہنچ جائے تو وہ ایک گھنٹے بین سن کر بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس مجلسِ آہ و بکاہ میں دو ڈھائی سو مردوں میں آج کا مرحومِ خصوصی کون ہے۔
>
> خاکم بدھن از مشتاق احمد یوسفی

بھاری تعداد بیرون ممالک مقیم تھی سب کو اطلاع کر دی گئی کہ اپنی پہلی فرصت میں اپنے آنے کی یقین دہانی کروائیں تاکہ تاریخ مقرر کی جا سکے۔ ماموں جی، کچھ کزنز اور دوستوں کی طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۹۵ء کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہر طرف ہرکارے دوڑا دیے گئے کہ شادی میں شامل ہوں اور ثواب دارین حاصل کریں۔ گھر بھر کی کیا پورے محلے کی فضا بدل گئی۔ شادی کی رسومات کے آغاز پر ہی گلی محلے کی ناکہ بندی تو شامیانوں اور قناتوں سے یوں ہوتی ہے جیسے کوئی فوج مورچہ زن ہو رہی ہو۔ ہر مناسب مقام پر مورچے لگا دیے گئے۔ اڑوس پڑوس کے گھروں کو بھی سجانے سنوارنے کا انتظام کر لیا گیا۔ مرد حضرات کہاں بیٹھیں گے، خواتین کہاں بیٹھیں گی سب انتظامات کی نوک پلک درست کی جا رہی تھی۔ والدہ حضور اور دیگر رشتہ دار خواتین بازاروں کا رخ کیے بیٹھی تھیں۔ ہر کوئی اپنی دھن میں لگا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں؟ کیا فرمایا ہے کسی شاعر نے

جانے یہ کس طرح کی وحشت ہے
نہ کوئی کام ہے نہ فرصت ہے

خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا اور دن گننے لگا۔ یہی گنتی جاری تھی کہ گلی میں شور اٹھا ''مرچیں لگانے والے آ گئے!'' میں حیران کہ شادی سے پہلے کیونکر مرچیں لگ سکتی ہیں یہ تو ساس بہو کے جھگڑوں کے بعد کا سین ہے خیر عقدہ کھلا کہ برقی قمقموں کو مقامی

بولی میں مرچیں کہتے ہیں وہ لگ رہی ہیں۔ گھر والوں کی مصروفیت اپنی جگہ لیکن مجھے سب سے زیادہ دکھ اپنے جگری دوستوں کی بے اعتنائیوں کا تھا ایسے ایک دم غائب ہوئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ گلہ کرتا تو کہتے یار تیری شادی کی مصروفیت ہی بہت ہے۔ آخر مہندی کی شام آئی۔ ایکدم سے میں سب کی آنکھوں کا مرکز بن گیا۔ اپنا آپ بہت اہم لگنے لگ پڑا۔ ہاتھوں میں گانا (پتہ نہیں اردو میں کیا لکھتے ہیں) کندھوں پر رنگین چادر اور ہاتھوں میں لوہے کی چھڑی جس پر پھول ہی پھول لگے تھے میں پھولے نہیں سما رہا تھا انہی لمحات میں دل میں کہیں یہ خیال ابھرا کہ بقرعید پر بکرا بھی ذبح ہونے سے پہلے ایسے ہی سوچتا ہوگا؟ اس سوچ نے واپس حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔ دیکھا تو گاؤں بھر کی عورتیں گندم کے دانوں کی پلیٹیں اٹھائے جوق در جوق آئی جا رہی ہیں۔

دیہات میں ہماری طرف رواج ہے کہ مہندی کی شام خواتین اپنے گھروں سے دانے لاتی ہیں اور بدلے میں خشک مہندی لے کر جاتی ہیں۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں ان کے لائے دانے ویسے میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ وہ نائی کے ہوتے ہیں جو شادی پر سب انتظامات کا سرخیل ہوتا ہے۔

خواتین کے رنگا رنگ اجتماع میں یوں مرکزی حیثیت سے بیٹھنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا ہر پری چہرہ نظروں کے سامنے سے گذرتا تو یہی لگتا کہ پیغام دے رہا ہو "چنگی نیہوں کیتی" لیکن وقت کا کام ہے گذرنا سو یہ ہنگاموں بھری شام بھی گذر گئی۔

اگلی صبح سویرے سویرے ہی جگا کر قبرستان روانہ کر دیا گیا۔ یہ بھی ایک رسم تھی کہ شادی والے دن اپنے تمام فوت شدہ بزرگان اور رشتہ داروں کی قبروں پر دولہا اپنے دوستوں کے ہمراہ دعا کے لئے جاتا ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا نائی کی دکان پر۔ جہاں اس بے چارے نے خاص انعام کے لالچ میں بہت محنت کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہمارے ہاں شادی کی رسموں میں ایک اہم رسم وقت پر نہ پہنچنا بھی ہے لیکن ہمارے مہمانوں کو قدرت نے مزید مہلت دی کہ ساون زوروں پر تھا اور اتنی موسلا دھار بارش برس رہی تھی کہ ایک وقت محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ کرکٹ میچ کی طرح شادی بھی اگلے دن پر ملتوی کر دی جائے گی لیکن ۔۔۔ آخر تقدیر کو رحم آیا بارش رک گئی اور دولہا کو سجا سنوار کر پیش کر دیا گیا۔ سلامیاں وصول کر کے طبیعت بحال ہو گئی۔ خلافِ توقع اچھے دام مل رہے تھے۔

لڑکی والوں کا گھر پاس ہی تھا چنانچہ بنا کسی تاخیر کے بارات پیدل چل پڑی۔ جیسے ہی بارات اس مقام پر پہنچی جہاں سے فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ آگے بڑھا جائے کہ پیچھے جایا جائے۔ پھر سے موسلا دھار بارش نے آلیا۔ میرے سمیت بارات کی یہ حالت تھی کہ گھٹنوں تک پانی، بلکہ جن احباب نے شادی کی وجہ سے نئے جوتے پہنے تھے ان کے جوتے بھی ہاتھ میں تھے کہ مبادا خراب ہو جائیں۔ لگتا تھا کہ چوروں کی بارات جا رہی ہے۔ اسی جہادی کیفیت میں منزل مقصود پر پہنچے۔ لڑکی والوں نے بارات کو کس طرح نچوڑ کر خشک کیا وہ الگ کہانی ہے میری حالت اس وقت اس طالب علم والی تھی جو بڑے سخت امتحان کی تیاری کر کے وائیوا دینے بیٹھا ہو اور کوئی سخت گیر ممتحن اسے فیل کرنے کے درپے ہو۔ تیاری تو کافی اچھی تھی۔ سن رکھا تھا کہ مولوی صاحب چھ کلمے سنتے ہیں بلکہ آج کل تو رعائیت بھی دیتے ہیں کہ خود ہی پڑھ دیتے ہیں اور لڑکا ساتھ من من کر کے رسم پوری کر دیتا ہے نوجوان نسل پر بوجھ ڈالنا ہی نہیں چاہیے کہ وہ کلمے بھی یاد کریں اور گانے بھی۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ مولوی صاحب نے کلمے شروع کر دیے میں سمجھا خطبہ پڑھ رہے ہیں جب تک مجھے سمجھ آئی مولوی صاحب اپنا کام ختم کر چکے تھے اور مبارک سلامت کا شور اٹھ چکا تھا۔ اللہ جانتا ہے اس وقت سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ایجاب وقبول کو جیسا ہے جہاں ہے کی بنیاد پر تسلیم کر لیا جائے یا کسی فقیہہ سے پوچھا جائے کہ "اک واری فیر؟"

سیانوں سے سنا تھا کہ نکاح کے موقع پر ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا لیکن پھر خیال آیا کہ اتنے طوطوں کے عوض ایک فاختہ ہاتھ آ گئی، سودا برا نہیں۔

بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی، رسمیں تھیں کہ پریشانی کی طرح بڑھتی چلی جا رہی تھیں، دوست تھے تو میرا نام لے کر اپنے

مزے لوٹ رہے تھے۔ شام ہوگئی۔ والدین کا پلان تھا کہ لڑکی کو ڈولی میں لے کر جائیں گے لیکن موسمی صورتحال ایسی تھی کہ ڈولی کی پائیداری مشکوک تھی۔ کار کا بندوبست کرنے والا اپنے ساتھ سوزوکی لے آیا اور سوزوکی بھی وہ جس پر قاضی صاحب سکول جایا کرتے تھے۔ مرتے کیا نہ کرتے اسی پر رخصتی ہوئی۔

اپنے گھر پہنچے تو ایک نئی رسم منتظر تھی۔ دلہن کے سر پر سہاگن ساس سات مرتبہ پانی وار کر پینے کی کوشش کرتی ہے اور بیٹے نے وہ برتن چھیننا یا گرانا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم اس کا پسِ منظر کیا ہے مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ لڑکے کو اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ بیٹا اب یہی ہونا ہے۔ خیر اس بیہودہ رسم کے بعد کچھ دیر کے لئے سکون ملا۔ دوستوں کی اٹھکیلیاں، من میں پھوٹتے لڈو اور نہ جانے کیا کیا سب ایک ساتھ چل رہا تھا۔ بارش نے ولیمے کے انتظامات درہم برہم کر کے رکھ دیے تھے اور خاندان کے بزرگوں کو اپنی ناک بارش کے پانی میں ڈوبتی نظر آ رہی تھی لیکن اپنا لیول اس وقت ان کاموں سے انتہائی اونچا تھا۔

آخر حجلہ عروسی کی طرف جانے کا حکم صادر ہوا۔ دل میں ہزاروں ارمان لیے ابھی قدم رنجہ فرمایا ہی تھا کہ واپڈا والوں نے تعاون کیا بجلی بند کر دی۔

شبِ وصال ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام، جلنے والوں کا

باہر بارش، اندر حبس، رات بیت گئی۔

اگلی صبح مطلع ابر آلود تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ تمام شامیانے قناتیں سیدھی کی گئیں ولیمے کے انتظامات کو ہنگامی وفوجی اقدامات سمجھ کر انجام دیا جانے لگا۔ مہمانوں کی آمدورفت کی ابھی امید بھی نہیں تھی کہ تیسری جنس پہنچ گئی۔

یہ لوگ غالباً اپنے نام کی طرح تیسری دنیا کے ممالک میں ہی پائے جاتے ہیں۔ مہذب انداز میں خواجہ سرا اور عوامی زبان میں ہیجڑے یا کھسرے۔ ان کا مخبری کا نظام ایسا زبردست ہوتا ہے کہ پاتال میں بھی ہونے والے واقعہ کی خبر انہیں ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں انہیں یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ دولہا میٹرک میں کس ڈویژن

گرمی اور لوڈشیڈنگ نے لوگوں کی مت مار کے رکھ دی ہے' سوال کچھ پوچھیں' جواب کچھ ملتا ہے۔ میں نے کل اپنے ہمسائے سے پوچھا ''گرمی کچھ زیادہ نہیں ہوگئی؟''

اطمینان سے بولا ''ہاں، لیکن قیمے والا نان زیادہ اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے بوکھلا کر بارش اور قیمے والے نان کے درمیان جائز و ناجائز تعلق تلاش کرنے کی کوشش کی اور دوبارہ پوچھا ''بھائی جی! قیمے والے نان کا گرمی سے کیا تعلق؟''

گھور کر بولا ''مجھے کیا پتا کسی ترکھان سے پوچھو!''

میں سمجھ گیا کہ موصوف کو اندرونی و بیرونی گرمی مار گئی ہے لہٰذا بڑے ادب کے ساتھ ان کا ہاتھ پکڑ کر دکان پر لے گیا اور ایک عدد صابن مع ایک عدد بوتل روح افزاء گفٹ کر دی۔

لاہور کی اکلوتی نہر اس وقت غریبوں کا سوئمنگ پول بنی ہوئی ہے' اس نہر میں نہانے والے اپنے بیشتر ''معاملات زندگی'' نہاتے نہاتے ہی سرانجام دے ڈالتے ہیں' شاید یہی وجہ ہے کہ جو اس نہر میں ایک بار نہا لیتا ہے، پھر ساری زندگی نہاتا ہی رہتا ہے۔ میرے ایک دوست کو اس نہر میں نہانے کا بہت شوق تھا لیکن دو سال پہلے اسے نہر سے سخت نفرت ہو چکی ہے۔ موصوف نہر میں بھی ایسے نہاتے تھے جیسے گھر میں نہاتے ہیں۔ ایک دفعہ نہا کر نکلے تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ نہر کے کنارے رکھے ہوئے کپڑے غائب تھے۔ وہ فوری طور پر گہرے پانی میں کھڑے ہو گئے اور باہر کھڑے لوگوں سے مدد کی اپیل کرنے لگے۔ کسی رحمدل انسان کو ترس آ گیا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ''اخبار'' ان کی طرف اچھال دیا۔ سنا ہے گرتے پڑتے گھر تو پہنچ گئے تھے لیکن جہاں جہاں سے بھی گزرے، عوام نے ''ہر خبر پر نظر'' رکھی۔

گلِ نوخیز اختر

میں پاس ہوا تھا اور ایف ایس سی میں کس مضمون میں کمپارٹ آئی تھی اس کی بھی انہیں آگاہی ہوتی ہے۔ انہیں نہیں پتہ ہوتا تو ناچنے اور گانے کا لیکن یہ دونوں کام کرتے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی کہہ لیں لوگ ان کی دعا بد دعا کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے ضلع میں ایک خانقاہ ہے ''ہیجڑے کی خانقاہ'' اللہ جانے وہاں لوگ جا کر کیا منتیں مرادیں مانگتے ہیں لیکن سنا ہے کہ وہاں پر بھی کافی تعداد میں مریدین موجود رہتے ہیں۔ مشہور مزاحیہ اداکار منور ظریف نے اپنی ایک فلم میں کہا تھا ''یہ تو وہ جنس ہے جن کے برتنوں میں دہی نہیں جمتا۔'' اِن کا دہی جمے نہ جمے لیکن ان کا کاروبار خوب جمتا ہے۔ میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بے اولاد عورتیں آتی تھیں اور اپنا کیا ہوا دوپٹہ اور ساتھ چند روپے ہیجڑے کو نذر کرتی تھیں وہ ہیجڑا وہ دوپٹہ اور پیسے رکھ لیتا اور اپنے پاس سے موجود گٹھڑی میں سے ایک دوپٹہ انہیں دے دیتا۔ خوش عقیدہ لوگوں کا گمان ہے کہ ہیجڑے کی دوپٹے کی برکت سے انہیں خوشخبری مل جائے گی۔ دنیا امید پر قائم ہے لیکن ہیجڑوں کے گائے گئے گانوں سے کسی بھی قسم کی امید بار آور ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ خدا جانے ان کا میوزک ڈائریکٹر کون ہوتا ہے جو انہیں گانے منتخب کر کے دیتا ہے اور وہ انہیں گائے جاتے ہیں۔ ذرا چند گانے ملاحظہ فرمائیں۔

''اسیں یاد آئیے سانوں بھل جاویں، اسیں مر گئے سانوں رووِیں نہ!''

''ادھر زندگی کا جنازہ اٹھے گا، ادھر ان کے ہاتھوں پہ مہندی سجے گی!!!''

''چلو اچھا ہوا تم بھول گئے!!!''

ان دنوں بالی وڈ کا سب سے ہٹ گانا تھا۔

گورے گورے مکھڑے پہ کالا کالا چشمہ

ہیجڑوں نے اس گانے کی جو درگت بنائی مجھے خود پر ترس آ گیا۔ میں نے ان سے درخواست کی ''اوّل تو یہ گانا بنتا ہی نہیں۔ اگر کلر اور ریٹنڈ گانا گانا ہی ہے تو گاؤ، نی کالا شاہ کالا، میرا کالا اے دلدار، ورنہ چپ رہو۔''

لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ چنانچہ سنتا رہا، شرماتا رہا۔

اُنہی ہلے گلوں میں دن گذرتا جا رہا تھا۔ میرے کالج کے سکول کے تمام اساتذہ اور دوست آئے ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اسی اثناء میں پتہ چلا کہ ہماری کرکٹ ٹیم کا فاسٹ باؤلر حافظ یاسین ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو گیا ہے۔ شام کو سیمی فائنل میچ تھا۔ چنانچہ ولیمہ کھا کر جیسے ہی دوست نکلے، دولہا میاں بھی ساتھ ہی کٹ پہن کر عازمِ میدان ہوئے۔ رفاقت گو کافی پرانی تھی لیکن نئے رشتے کو ابھی کچھ گھنٹے ہی ہوئے تھے، اعتماد میں لیا کہ میں ذرا کھیل کے ابھی آیا کسی کو بتانا نہیں۔

وہ میرا دن تھا۔ میں نے چار وکٹیں لیں اور ٹیم کو فائنل میں پہنچا دیا۔ گراؤنڈ سے ایک بار پھر پوری بارات مجھے گھر تک چھوڑنے آئی۔ لیکن وہاں حالات ویسے نہیں تھے جیسی توقع تھی۔

زوجہ محترمہ ابو جی کو نہ صرف میچ کے متعلق بتا چکی تھیں بلکہ جمعہ کی نماز گول کرنے کا بھی اشارہ کر دیا تھا۔ شومئی قسمت کہ جب میں گھر سے نکلا، اس کے بعد کسی بزرگ مہمان کو جانے کا خیال آیا تو انہوں نے دعاؤں کے لئے طلب کر لیا، وہاں موجود نہ ہونے پر تفتیش کی کڑیاں ملائیں گئیں اور یوں وہی کام جو میں روزمرہ کیا کرتا تھا، شادی کے پہلے دن ہی جرم قرار دے دیا گیا۔ گویا قدیم انگلستان کی روایت کی طرح پھانسی لگ گئی، تماشا ختم ہوا۔ لوگ اس کو زندگی کا مبارک سفر کہتے ہیں۔ اللہ کرے سی چنگیاں!

محمد عمران قاضی کا تعلق چکوال (پنجاب) سے ہے لیکن غمِ روزگار کے سبب ہانگ کانگ میں مقیم ہیں۔ قلم سے فلرٹ کافی عرصے سے جاری ہے۔ طنز و مزاح سے علاقہ بلکہ ''تھانہ'' رکھتے ہیں۔ اندازِ تحریر میں خاصا کرنٹ دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ لفظ لفظ پھلجڑیوں سے مزین ہوتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی اوّلین تحریر ہے۔

خادم حسین مجاہد

مستقبل میں تاک جھانک

صبح ہوتے ہی میرے لاشعور نے میرے شعور کو تھپڑ مار کر جگایا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہی کام بیگم نے کر دینا ہے۔ میں نہار منہ بیگم سے مار کھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی اس قسم کے ''درشن'' کے بعد پورا دن برباد کرنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا، لہٰذا با دلِ نخواستہ بستر کو داغِ مفارقت دے کر خمار آلود آنکھوں سے ڈول تلاش کرنے لگا تا کہ دودھ لا سکوں۔ ڈول پکڑ کر دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے گرد و نواح میں نامانوس سی تبدیلی محسوس کی۔ گھر سے نکلتے ہی میری آنکھیں یوں کھل گئیں جیسے عوام کی الیکشن کے بعد کھل جاتی ہیں اور جو کچھ میں نے دیکھا اس کے بعد آنکھوں پر سے میرا ایمان سیاستدانوں کے بیانوں کی طرح اٹھ گیا کہ میرے سامنے ہڑپہ کی کھدائی کا منظر پیش کرنے والی سڑک کی بجائے کئی منزلہ سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر منزل شیشے کی طرح چمک رہی تھی پہلی منزل سے پیدل چلنے والے گزر رہے تھے، دوسری منزل سے صرف پانچ پہیوں والی سائیکلیں اور تیسری و چوتھی منزل سے بالترتیب دو پہیوں والی کاریں اور جیٹ جہاز نما کاریں گزر رہی تھیں، مزید اوپر پہنچنے میں میری نظر کسی غریب کی فائل کی طرح ناکام ہو گئی تو میں نے اِرد گرد نظر دوڑائی جیسے سائل پر کلرک

دوڑاتے ہیں۔ پیدل چلنے والی منزل کے ایک طرف کچھ فاصلے پر ایک عجیب وغریب کیبن نظر آرہا تھا۔ میں متجسس قدموں سے کیبن کی طرف بڑھا۔ لوگ مجھے اس تندہی سے گھور رہے تھے جیسے خدانخواستہ میں لڑکی تھا لیکن جلد ہی میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔

میرا حلیہ اور لباس ان سب سے مختلف تھا اور وہ سب ایک ڈیزائن کے لباس میں تھے جس کا رنگ چمکدار اور سفید تھا اور ہر آدمی کے سینے پر سبز، سرخ اور نیلے رنگ کے بٹن موجود تھے۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ ان بٹنوں کو دبا کر دیکھوں کہ کیا ہوتا ہے مگر پھر میں اس ارادے سے باز رہا کہ وہ سب سے پہلے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر نہ جانے میرا کیا حشر کرتے۔ میں نے ابھی تک کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی پھر ایک خیال کے تحت میں نے دودھ کا ڈول سڑک پہ گرا دیا اور خود دور ہٹ گیا۔ فوراً سب اس کی طرف دوڑے اور اپنی جیبوں سے عجیب وغریب آلات نکال کر اسے چیک کرنے لگے۔ یقیناً وہ مجھے دہشت گرد قسم کی کوئی چیز سمجھ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے تین آدمی میری طرف بڑھے میرے لئے کوئی راہِ فرار نہ تھی اس لئے میں نے خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ وہ لوگ مجھے لے کر ایک عجیب وغریب کیبن کے پاس پہنچے۔ کیبن کا کوئی دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بیرونی دیواروں پر نیلی شعاعیں دوڑ رہی تھیں۔ ان لوگوں نے دیوار میں موجود بٹن دبایا تو ایک لمحے کے لئے میری میری آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی پھر جب یہ دھند چھٹی تو ہم کسی اور جگہ موجود تھے شاید یہ کیبن کا اندرونی حصہ تھا۔ چاروں طرف عجیب غریب مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ اس حصے کے درمیان میں ایک بہت بڑی سکرین روشن تھی، جس پر کئی منزلہ سڑک کی ہر منزل سے گزرنے والی ٹریفک واضح نظر آرہی تھی۔ مجھے لانے والے آدمیوں میں سے ایک نے اشفاق احمد کے ڈراموں کی طرح سمجھ نہ آنے والی کسی زبان میں نیلے انسان سے کچھ کہا تو اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک کرسی نما چیز پر بٹھایا اور میرے سر پر ہیلمٹ نما چیز رکھ دی، جس میں سے بہت سی تاریں نکل کر دیواروں کے ساتھ موجود مشینوں تک جا رہی تھیں۔ اب ان میں سے ایک مشین پر ایک چھوٹی سی سکرین روشن ہو چکی تھی۔ سب کی نظریں اس سکرین پہ لگی ہوئی تھیں۔ سکرین پر بہت سی اشکال بن اور بگڑ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف ہندسے بھی جل بجھ رہے تھے۔ دس منٹ تک یہ کھیل چلتا رہا پھر نیلے انسان نے میرے سر سے ہیلمٹ چیز ہٹائی اور میرے ساتھ آنے ولے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے دیوار کے پاس جا کر ایک بٹن دبایا تو دیوار کا وہ حصہ لٹو کی طرح گھوم گیا۔ دیوار پھر برابر ہوئی تو وہ لوگ موجود نہیں تھے۔ اچانک نیلے انسان کے منہ سے مشینی انداز سے یہ جملے برآمد ہوئے ''تمھارا دماغی تجزیہ کر کے ہم تمھارے بارے میں سب کچھ جان گئے ہیں۔ تم ۲۰۰۰ء میں اپنی بیگم کی خوف سے سہم کر گھر سے باہر نکلے تھے اور الیکٹرومیگنیٹک ریز کے ریلے کی زد میں آکر ۲۱۰۰ء میں نازل ہوگئے۔ بیگم کی نافرمانی کرنے والوں کا برا انجام ہوتا ہے اور اب بتاؤ تمھارا کیا کیا جائے، کیا تمھیں تمھارے زمانے میں واپس چھوڑ دیں؟''

''خدا کے لئے یہ ظلم مت کرنا!'' میری آنکھوں میں بیگم کی صورت پھر گئی اور میں کانپ کر رہ گیا۔

''واپس تو تمھیں ہر حال میں جانا پڑے گا، ہاں کوئی خواہش ہو تو بتاؤ۔'' اُس نے ایک بار پھر مشینی انداز میں اُردو بولی۔

''اگر ہو سکے تو مجھے اپنے زمانے کی سیر کرا دو تاکہ میں جا کر سائنسدانوں کی آنکھیں کھول سکوں۔'' میں نے اس خواہش کا اظہار کر دیا جو کیبن میں داخل ہوتے ہی میرے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی۔

''ہاں یہ ممکن ہے۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں!!'' اُس نے یہ کہہ کر اوپر پینل پر موجود کچھ بٹن دبائے تو بڑی سکرین پر نظر آنے والی عظیم الشان سڑک کی دسویں منزل پر چلنے والی دو سیٹوں کی کاروں میں سے ایک رک گئی اور اس میں سے ایک ڈرائیور اتر کر سائیڈ میں موجود لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے بس سٹاپ اور دوسرے پبلک مقامات پر استعمال ہونے والے جملے کا سہارا

لیا، کیونکہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا لیکن میں اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا جتنا بند کمروں میں بیٹھنے والے زمین پر کھلے آسمان کے نیچے سونے والوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

''کیوں نہیں میرا نام اللہ دتہ ہے اور میں روبوٹ ہوں۔''

''اللہ دتہ۔۔۔ روبوٹ؟'' میں نے حیرت سے اٹکتے ہوئے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق تمھارے زمانے کے لوگ اسی قسم کے نام رکھتے تھے لیکن اب ان کا رواج انسانوں میں ختم ہو گیا ہے تو سائنسدانوں نے ماضی کی یادگار کے طور پر روبوٹوں کے نام اس طرح کے رکھنے شروع کر دیے ہیں۔ اسی طرح ہر زمانے کی تمام زبانیں ان کے اندر فیڈ کر دی گئی ہیں۔''

''تمھاری ڈیوٹی کیا ہے؟''

''میں ٹریفک مینیجر ہوں، اس بڑی سکرین پر تم جو ٹریفک دیکھ رہے ہو اس کو اس کیبن میں موجود خود کار کمپیوٹر کنٹرول کرتا ہے۔ میرا کام اس کام کی نگرانی کرنا ہے اور اس میں پیدا ہونے والی کسی بھی خرابی کو دور کرنا ہے۔ ایسے کیبن ہر ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک کے ساتھ موجود ہیں، اس کیبن سے اگلے کیبن میں میرا دوست اللہ وسایا ڈیوٹی دیتا ہے۔''

اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، اللہ دتہ کے سامنے پینل پہ موجود ایک بلب جل اٹھا۔ اللہ دتہ نے پینل پہ موجود ایک بٹن دبایا تو ایک چھوٹی سی سکرین روشن ہو گئی۔ اس میں وہی ڈرائیور نظر آ رہا تھا جو دسویں منزل پہ گاڑی روک کر لفٹ پر بیٹھا تھا۔

''باہر ڈرائیور کرم دین آیا ہے، یہ تمھیں سیر کرائے گا لہٰذا تم کرسی چھوڑ کر دیوار کے پاس پہنچو تا کہ میں تمھیں باہر بھجوا سکوں۔'' اللہ دتہ نے کہا۔

''ہمارے زمانے میں بھی کسی کو کرسی پر سکون سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا تھا۔ لگتا ہے اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔'' میں زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا تو اللہ دتہ نے کوئی بٹن دبایا، اگلے ہی لمحے میں اس کیبن کے باہر تھا۔ وہاں اللہ دتہ ہی کی شکل کا ایک روبوٹ موجود تھا۔ صرف اس کا رنگ سرخ تھا، وہ مجھے لفٹ کے ذریعے دسویں منزل پہ لے گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے اسے لائبریری میں جانے کا کہا۔ کرم دین گاڑی جس رفتار سے چلا رہا تھا وہ اپنے زمانے کے رکشہ سے بیس گناہ زیادہ ہو گی لیکن جھٹکے یا شور کا ملک میں انصاف کی طرح نام و نشان نہ تھا۔ اردگرد کی ٹریفک ہم سے بھی زیادہ تیزی سے رواں دواں تھی۔ سڑک کے کنارے حدِ رفتار ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی تختی پڑھ کر رفتار کی الجھن دور ہوئی تو میں نے پشت گاہ سے سر لگایا۔ اچانک سامنے سے آنے والی گاڑی نے ہماری گاڑی کو ٹکر مار دی۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے وہ سارے گناہ قرض خواہوں کی طرح یاد آ گئے جن کی پاداش میں اس پرائی صدی میں ایسی ہولناک موت راہ تک رہی تھی۔ چند لمحوں تک آنکھیں بند کیے میں نے اپنے جسم کے عاشق کے دل سے زیادہ ٹکڑے ہونے کا انتظار کیا، جب کچھ نہ ہوا تو میں نے سوچا شاید ابھی میں گر رہا ہوں، ٹکڑے زمین پر پہنچنے کے بعد ہوں گے لیکن ایک منٹ گزر گیا اور میرے جسم میں کسی قسم کی تقسیم عمل میں نہ آئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو بے یقینی سے انھیں ملنے لگا کیونکہ ہم تینوں (کار، کرم دین، اور میں) بخیریت تھے اور سفر میں تھے۔ یہ صورتِ حال میرے بھیجے میں فٹ نہیں ہو رہی تھی اور میں ملکی سیاست کی طرح الجھ گیا تھا۔ کرم دین نے میری کیفیت نوٹ کر لی تھی۔

''آپ حیران نہ ہوں، سب گاڑیاں ایسے میٹریل سے تیار کی گئی ہیں جو شدید سے شدید ٹکر کے جھٹکے کو جذب کر لیتا ہے اور اس طرح حادثہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔'' کرم دین نے وضاحت کی۔

سردیوں کا دن یوں گزرتا ہے جیسے اسے ہم سے بھی کوئی ضروری کام ہو۔ ادھر بندہ ظہر کی نماز پڑھ کے گھر نہیں پہنچتا کہ عصر کی اذان ہو جاتی ہے۔ ابھی عصر پڑھ کر بندہ گھر کا دروازہ ہی نہیں کھولتا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔

سس سس سردی از رفاقت حیات

سڑک کے ایک طرف پھیلے ہوئے عمارتوں کے عظیم الشان سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کرم دین نے بتایا" وہ لائبریری ہے، اس میں دنیا کے تمام علوم اور پوری دنیا کے ادب کی ہر کتاب کمپیوٹر کی چپ کی شکل میں موجود ہے۔آپ کے اپنے مطلوبہ چیزوں کی فہرست کمپیوٹر کے خانے میں ڈالنے سے "چپ ڈسک" برآمد ہو گی، اسے لائبریری میں موجد سی پی یو میں رکھیں، وہ آپ کو مطلوبہ میٹر پڑھ کر سنائے گا اور اگر آپ کو ضرورت ہو تو مطلوبہ میٹر کی کاپی بھی بنا کر دے گا۔"

"کیا پورے ملک میں صرف ایک ہی لائبریری ہے۔"

"ہر شہر میں ہو بہو اسی قسم کی لائبریری موجود ہے۔ دراصل دس سال قبل پوی دنیا کے علم و ادب کو چپ ڈسک پر منتقل کرنے کے بعد ان کی لاکھوں کاپیاں بنائی گئیں اور ہر شہر میں ایک لائبریری بنا کر ایک ایک کاپی وہاں رکھ دی گئی۔یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں موجود لائبریریز میں میٹر کے لحاظ سے قطعی کوئی فرق نہیں۔"

(یہ خیال انٹرنیٹ کی صورت میں حقیت کا روپ دھار چکا ہے) باتیں کرتے کرتے ہم لائبریری پہنچ گئے کرم دین نے روبوٹ لائبریرین کلو کارڈ چیک کریا اور ہم لائبریری میں داخل ہوئے، علم و ادب کے سمندر میں کافی دیر غوطے کھانے کے بعد میں نے کرم دین کو شعبۂ اخبارات کی طرف چلنے کو کہا۔ اخبارات انتہائی باریک پلاسٹک پر رنگین چھپے ہوئے تھے۔ میں چونکہ اس زبان سے اتنی ہی واقفیت رکھتا تھا جتنی منتخب نمائندے عوام کے مسائل سے رکھتے ہیں لہٰذا کرم دین نے اخبار کی چیدہ چیدہ اخباروں کی سرخیاں اردو میں سنائیں۔

"مشتری نے زحل کو خبردار کیا کہ وہ اس کی حدود سے کیوی جیسے حسین پرندے کی چوری سے باز آجائے ورنہ سزا کے طور پر اس کی حدود میں کوے چھوڑ دیئے جائیں گے۔"

"زحل نے نیپچون سے خلائی جنگی قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔"

"مریخ نے پلوٹو کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں سے باز آجائے ورنہ اس کو نظام شمسی سے کاٹ کر لاوارث چھوڑ دیا جائے گا۔"

"زہرہ پر فلم "ڈیجیٹل لو" کے یونٹ کو خوفناک حادثہ پیش آیا۔ وہ مائکرو جنگل میں شوٹنگ کر رہے تھے کہ آگ بھڑک اٹھی جس سے اس کے بیشتر ارکان زخمی ہو گئے، عطارد سے تعلق رکھنے والے دو اداکاروں کی حالت تشویش ناک ہے جبکہ زمین اور مریخ کے اداکاروں کی حالت خطرے سے باہر ہے۔فلم کی ہیروئینیں جو زہرہ سے تعلق رکھتی تھیں ان کو معمولی مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا۔"

"یونیورسل پولیس نے پلوٹو پر ایک مجرم کو گرفتار کیا ہے جو پچھلے چھ ماہ سے زمین ،مشتری، اور زحل پر دہشت گردی کی وارداتوں کا ذمہ دار ہے۔"

"یونیورسل پیس تنظیم نے تمام سیزروں کے سربراہوں سے تخفیف اسلحہ کی درخواست کی ہے۔"

"کہکشاں نمبر دس سے بارہ کی طرف محوِ پرواز سپیس کیپسول کو پلوٹو کے دہشت گردوں نے اغوا کر لیا۔سپیس کمانڈوز ان پر قابو پانے کی وکشش کر رہے ہیں۔"

مجھے حیرت سے سکتہ ہو چکا تھا کرم دین میری کیفیت سے بے نیاز آنکھ مارتے ہوئے بولا "اور اب ضرورت رشتہ کے اشتہار سنو۔ ایک ٹیسٹ ٹیوب کنواری دوشیزہ عمر صرف پندرہ سال ہے ،زہرہ پر وسیع رقبے کی مالک اس کے علاوہ چاند پر ذاتی بیوٹی پارلر بھی چلاتی ہے، مریخ پر ذاتی بنگلہ اور سپیس کار بھی رکھتی ہے، صرف بیس سال تک کی عمر کے لڑکے رجوع کریں، گھر داماد رہنا ہوگا۔"

قبل اس کے کہ کرم دین کوئی اور رشتہ بتاتا میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ کرم دین نے پتہ نہیں کیا پلایا کہ اگلے ہی لمحے میں چاق و چوبند ہو گیا، کرم دین کہہ رہا تھا "یہ ساری خبریں ساری کائنات میں سرگرم عمل روبوٹ نامہ نگاروں کی ارسال کردہ ہیں۔ چونکہ وہ انسانوں کی طرح جھوٹ نہیں بولتے لہٰذا ان کی بھیجی ہوئی خبریں سو فیصد سچ ہوتی ہیں۔ تمھارے لئے ان پر یقین کرنا مشکل ہوگا۔ دراصل ہم نے تمھارے زمانے کے دریافت کردہ نظامِ شمسی کے

سیاروں کو تسخیر کرنے کے علاوہ کئی مزید سیارے بھی دریافت کر کے تسخیر کرلئے ہیں۔ہمارے قدم کہکشاؤں تک بھی پہنچ چکے ہیں لیکن پھر بھی کائنات کے اسرار باقی ہیں جن سے پردہ اٹھانے کی ہم کوشش کررہے ہیں۔سیاروں کی تسخیر کے بعد انہیں ہم نے زمین کی کالونیاں بنادیا ہے۔بیس سال قبل زمین کی آبادی زمین کی گنجائش سے بڑھ گئی تھی تو اربوں انسانوں کو ان کالونیوں میں بسادیا گیا۔ان سیاروں پر شرح پیدائش زمین سے زیادہ ہے اور اب ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک سفر کرنا معمول کی بات ہے۔اکثر لوگ اپنے فرائض کی وجہ سے دن بھر نظام شمسی میں دوڑتے رہتے ہیں۔وہ سوتے زمین پر ہیں،شیو مریخ پر کرتے ہیں، ناشتہ عطارد پر کرتے ہیں،کام زہرہ پر کرتے ہیں،کھیلتے یورینس کے گراؤنڈ پر ہیں،لنچ پلوٹو پر کرتے ہیں،خریداری مشتری کی آٹومیٹک الیکٹرک مارکیٹ سے کرتے ہیں جبکہ ان کے بچے زحل کے سکول میں پڑھتے ہیں۔''

''سیاروں کے درمیان سفر اتنے کم وقت میں کیسے ممکن ہے؟''میں نے پوچھا۔

''تمام سیاروں کے درمیان جدید ترین سائنسی نظام لگایا گیا ہے،جس کے تحت ایک سیارے پر موجود ایک لیزر مشین کے ذریعے انسان کو الیکٹرونک ریز میں بدل کر مطلوبہ سیارے کی طرف روانہ کردیا جاتا ہے،جہاں موجود ایسی ہی مشین ان ریز کو وصول کر کے دوبارہ انسانی شکل میں لے آتی ہے۔چونکہ ریز کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہے لہٰذا کوئی بھی انسان سیکنڈوں میں ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک پہنچ جاتا ہے۔''

''لیکن کرمو بھائی۔۔۔ اگر راستے میں انسان کا کوئی الیکٹران ادھر ادھر ہوجائے تو کیا پھر بھی مشین اسے مکمل صورت میں لے آئے گی یا شکل میں کوئی تبدیلی وغیرہ پیدا ہوجائے گی۔''

''آغاز میں یہ تجربات جانوروں پر کئے گئے۔شروع شروع میں یہ ہوتا تھا کہ زمین سے ایک جانور بھیجا جاتا تو دوسرے سیارے میں کسی اور شکل میں ظاہر ہوتا یا اس کا کوئی عضو غائب ہوجاتا،سینکڑوں جانوروں کی قربانی کے بعد سائنس دان اس خامی پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔اب یہ طریقہ بالکل محفوظ ہے اگر چاہو تو لگے ہاتھوں مشتری وغیرہ کی بھی سیر کرلو۔'' کرم دین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''نا بابا نا۔۔۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا ''میں ایسے رسک کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''

''اب کہاں چلیں؟'' کرم دین نے پوچھا۔

''عجائب گھر!''

تھوڑی دیر بعد ہم ایک وسیع و عریض،اکیس منزلہ عمارت میں موجود تھے۔فلور پر قبل مسیح ایجادات اور آلات پڑے تھے۔ان کو دیکھ کر جب ہم پہلی منزل پر پہنچے تو وہاں پہلی صدی عیسوی کی اشیا رکھی ہوئی ملی تھیں۔اسی طرح دوسری،تیسری،چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کی اشیا رکھی گئی تھیں۔اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے جب ہم بیسویں منزل پر پہنچے تو وہاں بیسویں صدی کی اشیا پڑی تھیں۔ان میں ایف سولہ،اواکس،ایٹم بم،خلائی راکٹ اور ہماری صدی کی دوسری اشیا شامل تھیں۔

ہمارے شاعر دوست آخر مرادآبادی بڑے خوش ہیں اگرچہ اردو شاعری پر ہمارا بہت بڑا احسان ہے اور اس بنا پر ہمیں اردو شاعری میں ہمیشہ یاد رکھا جانا چاہیے کہ ہم نے تمام مواقع ملنے کے باوجود شاعری نہیں کی البتہ بیس سال کی عمر میں ہم نے مشاعروں میں آنا جانا شروع کردیا تھا ہمارے خیال میں اس سے کم عمر لوگوں لوگوں کو مشاعرے میں نہیں جانا چاہیے البتہ بحیثیت شاعر جانا ہو تب کوئی مضائقہ نہیں مشاعرہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں ہر شاعر سمجھتا ہے کہ دوسرا اس کا شعر سن کر محظوظ ہورہا ہے حالانکہ وہ اپنی باری قریب آنے کی وجہ سے خوش ہورہا ہوتا ہے،البتہ کبھی سننے والے ان کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ کلام تک نہیں کرتے ایک بار تو جناب آخر مرادآبادی صاحب نے جیل میں منعقدہ مشاعرہ ایسا لوٹا کہ وہاں کے لوگ انہیں اپنے پاس رکھنے پر بضد تھے،ان کی اواز میں سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے،جی ہاں سننے والوں نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

کرم دین نے بتایا کہ اب یہ اشیاء متروک ہو چکی ہیں۔اس کے بعد وہ مجھے اکیسویں اور آخری منزل پہ لے گیا جہاں اکیسویں صدی کی ایجادات وغیرہ دیکھتے ہوئے مجھے مسلسل حیرت کے جھٹکے لگتے رہے۔

جب ہم عجائب گھر سے نکلے تو مجھے بھوک محسوس ہوئی میں نے کرم دین سے اس کا ذکر کیا۔

''کیا کھاؤ گے؟؟'' اُس نے پوچھا

''میرا تو اس وقت بکری کا گوشت کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ساتھ میں روسٹ مرغ ہو تو کیا بات ہے۔''

تھوڑا سا چلنے کے بعد کرم دین مجھے لے کر آسمان سے راز و نیاز کرتی ہوئی ایک شاندار عمارت میں داخل ہوا۔ریسیپشن سے گزرنے کے بعد ہم ایک پلیٹ فارم پہ کھڑے ہوئے۔کرم دین نے دیوار میں موجود کوئی بٹن دبایا تو پلیٹ فارم آگے کو حرکت کرنے لگا اور ایک فرلانگ طے کرنے کے بعد پلیٹ فارم ایک بہت بڑے ہال کے باہر رکا اور ہم اس میں سے اتر کر ہال میں داخل ہوئے۔

سبز شیشے کے فرش سے گزر کر جونہی ہم سنہری شیشے کی میز پر بیٹھے ایک روبوٹ ویٹرس آموجود ہوئی۔کرم دین نے اسے مطلوبہ آرڈر بتایا اس دوران وہ قاتلانہ مسکراہٹیں پھینکتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ویٹرس میز پر دو بوتلیں رکھ گئی۔جاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھ کر اپنی بلب نما آنکھ بھی ماری۔ایک بوتل میں سرخ سیال تھا جبکہ دوسری میں زرد۔میں نے استفہامیہ نظروں سے کرم دین کو دیکھا تو اس نے مجھے پینے کا اشارہ کیا۔میں نے اللہ کا نام لے کر زرد بوتل پینا شروع کی تو یوں محسوس ہوا جیسے میں بکرے کا گوشت کھا پی رہا ہوں۔دوسری بوتل چکھی تو مرغ روسٹ کے جیسا ذائقہ تھا۔

میری حیرت بھانپ کر کرم دین بولا ''اب ہوٹلوں میں ہر قسم کی خوراک کے اجزاء کو مائع گیس یا ٹھوس کی شکل میں سٹور کرلیا جاتا ہے جو طلب کرنے پر سرو کردی جاتی ہے۔''

کھانے کے بعد میں نے پچاس ہزار کی ڈکار ماری، جس سے دیوار میں موجود لائینیں خراب ہو گئیں۔

''یار کرم دین!اب تو کسی باغ کی سیر کراؤ۔'' ہوٹل سے نکل کر میں نے کرم دین سے کہا۔

باغ میں پہنچ کر میری حیرت آبادی کی طرح انتہائی درجے تک پہنچ گئی کیونکہ ہر طرف ایک پودے پر ہی ہر قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے اور ایک ہی درخت ہر قسم کے پھل سے لدے ہوئے تھے۔کرم دین نے بتایا کہ وہ جدید زرعی سائنس کی مدد سے ایک ہی کاشت سے ہر مقسوم اور ہر قسم کی فصل زیادہ مقدار میں حاصل کر لیتے ہیں جو ایک بڑی آبادی کے لئے کافی ہوتی ہے۔

کچھ وقت باغ میں گزار کر جب ہم دوبارہ سڑک پر آئے تو ایک انتہائی عجیب وغریب عمارت نظر آئی، جس کی چھت پر عجیب وغریب آلات لگے ہوئے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک آلے سے سرمئی رنگ کی گیس نکلی اور آسمان پر بادل کی شکل اختیار کر کے برسنے لگی۔

میں نے کرم دین سے اس بارے استفسار کیا تو اس نے بتایا ''یہ عمارت محکمہ موسمیات کی ہے، یہاں انسان نے اللہ کی دی ہوئی عقل اور علم سے کام لے کر موسم کو قید کرلیا ہے،اس میں ایسے انتظامات ہیں کہ ہر موسم کو گیس کی شکل میں ذخیرہ کرلیا جاتا ہے مثلاً گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی اور برسات میں بارش کو پھر زیادہ گرمی میں سردی کو چھوڑ کر موسم معتدل کرلیا جاتا ہے جبکہ فصلوں کے سیزن میں بارش نہ ہو تو سٹور کی ہوئی بارش کام میں لائی جاتی ہے آج کل فصلوں کا سیزن ہے اس لئے مصنوعی بارش برسائی جارہی ہے۔''

بارش رکنے کے بعد قبل اس کے کہ میں کرم دین سے کہیں اور جانے کی فرمائش کرتا کرم دین نے مجھے ایک باریک سی پتری دی جس پر سنہری لکیریں لگی ہوئی تھیں۔

''یہ پتری اپنی کنپٹی پہ چپکا لو اس کے بعد تمہیں اپنی خواہش مجھ سے نہیں کرنی پڑے گی بلکہ میں خود بخود سمجھ جاؤں گا'' کرم دین نے کہا۔

میں نے پتری کنپٹی سے لگائی وہ چپک گئی اسی وقت میرے

دل میں بحری سیر کی خواہش پیدا ہوئی کرم دین فوراً بولا ''ٹھیک ہے ہم، اب ساحل سمندر کی طرف چل رہے ہیں۔''

ساحل سمندر پر کرم دین نے ایک سکوٹر نما چیز کرائے پر حاصل کی۔ اس کی باڈی میں جابجا سوراخ تھے۔ اس نے بحری سکوٹر کو سٹارٹ کیا، مجھے پیچھے بٹھایا اور ساحل پر چلاتے ہوئے سمندر میں داخل ہوگیا۔ میں نے خوف سے کانپتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور کرم دین کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کافی دیر گزر گئی، مجھے کوئی غوطہ نہیں آیا اور نہ میرا دم گھٹا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سمندر میں سڑک بنی ہوئی تھی جس پر ہمارے سکوٹر کے ساتھ اور بھی بحری ٹریفک چل رہی تھی۔ پانی سکوٹر کے سوراخوں میں سے گذر رہا تھا جس کی وجہ سے ہمیں حرکت کرنے میں وقت ہو رہی تھی۔ وہاں بحری سڑک کے کنارے عجیب و غریب ہیت کی مشینیں نصب تھیں جن کے بارے میں کرم دین نے بتایا کہ وہ آکسیجن پیدا کرتی ہیں اسی لئے ہمیں سانس لینے میں قطعاً کوئی دقت نہ ہو رہی تھی وہاں سمندری مخلوق کے ساتھ ساتھ انسانی ہاتھوں سے تعمیر کردہ دنیا بھی قابلِ دید تھی۔ کئی قسم کی عظیم الشان فیکٹریاں اور لیبارٹریاں سمندری خزانوں سے انسان کو مالا مال کر رہی تھیں۔

ایک بحری ہوٹل سے مختلف اقسام کی مچھلیوں اور جھینگوں کو پیٹ واصل کرنے کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے تو راستے میں اس سے اکیسویں صدی کے نظامِ تعلیم کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا ''اب تعلیم کی روایتی مشکلات ختم ہوگئی ہیں، پیدا ہوتے ہی بچے کو ایک ایجوکیشنل مشین میں ڈال دیا جاتا ہے، جس میں ساری دنیا کے علوم فیڈ کئے گئے ہیں۔ وہ علوم آہستہ آہستہ بچے کے دماغ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ پانچ سال بعد بچہ تمام علوم پر عبور حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں اس کو خوراک مشین میں موجود سسٹم کے ذریعے دی جاتی ہے۔ چھٹے سال میں بچے کو مشین سے نکالا جاتا ہے اور اسے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی اجازت مل جاتی ہے۔''

میڈیکل سائنس کے متعلق میرے سوال کے جواب میں کرم دین نے بتایا ''ہمارے سائنسدانوں نے برسوں کی محنت کے بعد

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے، بھارتی اس کا دودھ پیتے ہیں، اسی کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں، اور اس کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں، اس لئے کیونکہ وہ خود گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا۔ اُردو کی آخری کتاب از ابنِ انشاء

تمھاری صدی کی خطرناک بیماریوں ایڈز اور کینسر وغیرہ پر قابو پالیا ہے۔ دوسری تمام بیماریوں کا پہلے ہی خاتمہ کر دیا گیا تھا لیکن آج کل ایک نئی بیماری پیدا ہوگئی ہے جس کا علاج تاحال سائنسدان دریافت نہیں کر سکے۔ لوگ اکثر غذا میں بے احتیاطی کر جاتے ہیں اور کام خود کرنے کی بجائے روبوٹ سے لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پیٹ پہلے ڈھول کی شکل اختیار کرتے ہیں پھر پھٹ جاتے ہیں۔ میڈیکل سائنس کا ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ اب جنس بدلنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، صرف ایک گولی کھانا پڑتی ہے۔ کئی لوگ ضرورت کے مطابق صبح میں مرد ہوتے ہیں اور شام ہوتے ہی عورت بن جاتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمھیں بھی ابھی لڑکی بنا دوں۔''

''کیوں نہیں، تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے!'' میں اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔

کرم دین نے ایک نیلے رنگ کی گولی مجھے دی جسے کھاتے ہی مجھے اپنے وجود میں نامانوس سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ پانچ منٹ تک میرے جسم میں ہلکے ہلکے دھماکے ہوتے رہے، چھٹے منٹ میں جب میں نے اپنے جسم پر نظر ڈالی تو شرم سے دوہرا ہوگیا بلکہ دوہری ہوگئی کیونکہ میں لڑکی بن چکا تھا۔

''ہائے اللہ، آپ تو تابکار عناصر سے زیادہ خطرناک حسن کی مالک ہیں۔'' پہلا آوازہ کرم دین نے ہی کسا۔

شاید میں کوئی جواب دیتی لیکن اپنے گرد ہجوم دیکھ کر چپ رہی۔ ہجوم میں موجود ہر شخص نظروں ہی نظروں میں میرا ایکسرے کرنے میں مصروف تھا۔ سرخ رنگ کے بھڑکیلے لباس میں ایک وسیع و عریض پیشانی کا مالک شخص تو کچھ زیادہ ہی بے چین نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب و غریب سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ منہ کھل گیا اور آنکھوں

میں اُمید کا دریا بہنے لگا۔ پھر وہ تھوڑا سا آگے آ کر میرے آگے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور جیب سے ایک عجیب سی کتاب نکال کر اپنی زبان میں کچھ عرض کرنے لگا۔ میں نے الجھ آمیز نگاہوں سے کرم دین کو دیکھا۔

''یہ حضرت شاعر ہیں اور آپ پر تہہ دل سے عاشق ہونے کے بعد اپنی کمپیوٹر ڈائری سے آپ کے اجنبی حسن کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔'' کرم دین نے بتایا ''ہمارے سائنسدان اور پلان میکر ہزاروں سال پرانی اس نسل کو کوشش کے باوجود ختم نہیں کر سکے۔ اکثر شاعروں کو تار چر سیلوں میں ملازمت دی گئی ہے مگر پھر بھی یہ اتنے زیادہ اہم ہیں کہ بہت سے بیکار پھرتے ہیں اور پیشۂ عشق کو بدنام کرتے ہیں۔''

ہماری گفتگو کے درمیان کئی منچلے بھی پیش قدمی کر کے شاعر کے کندھے سے کندھا جوڑ کر میرے آگے دو زانو بیٹھ چکے تھے۔ قبل اس کے کہ کوئی خطرناک صورتحال پیدا ہوتی، میں نے امداد طلب نظروں سے کرم دین کی طرف دیکھا تو وہ پتری والے سسٹم سے سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے زرد رنگ کی ایک گولی میری طرف بڑھائی۔ گولی کھانے کے دو تین منٹ بعد میرے عاشقوں میں ہلچل مچ گئی کیونکہ مجھ میں اب نسوانیت کا شائبہ تک نہیں رہا تھا۔ شاعر صاحب اٹھ کر کرم دین کو پھاڑ کھانے دوڑے جس نے ان کو اجنبی حسن سے محروم کر دیا تھا۔ کرم دین نے غصے سے شاعر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکلے اور شاعر صاحب کے رہے سہے بال بھی جل گئے، پھر مجمع چھٹتے دیر نہ لگی۔

''وقت کیا ہوا ہے؟'' میں نے کرم دین سے پوچھا کیونکہ اس وقت میری گھڑی بند تھی۔

''اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ لیکن حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہی تو سائنس کا کمال ہے۔ اب رات اور دن کی تمیز ختم ہو چکی ہے۔ چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے۔ ہر آدمی چھ چھ گھنٹے بعد چار گھنٹے آرام کرتا ہے لیکن کاروبارِ زندگی مسلسل جاری رہتا ہے۔''

''تمھارے زمانے میں مجھے کہیں ٹرین نظر نہیں آئی؟''

''ٹرینیں متروک ہو چکی ہیں۔ تمھارے زمانے میں صرف طیارے ہی سفر کا تیز ترین ذریعہ تھے مگر اب ائر پورٹوں سے اندرون سیارہ نہ صرف طیارے بلکہ ہوائی کاریں اور موٹر سائیکلیں وغیرہ بھی پرواز کرتی ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے اشتیاق سے کہا ''کیا تم مجھے ہوائی کار کا سفر کروا سکتے ہو!!''

''بشرطیکہ کوئی پرواز جا رہی ہو کیونکہ پچھلے دن سے فضائی آلودگی کے خلاف ایک تنظیم کے ارکان ہوائی موٹر سائیکلوں پر فضا میں جلسے جلوس کر کے مزید آلودگی پھیلا رہے ہیں، جس کی وجہ سے کئی پروازیں معطل ہو کر رہ گئی ہیں۔''

ائر پورٹ کی عمارت اِتنی شاندار تھی کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کرم دین نے پتہ کر کے بتایا کہ پرواز جا رہی ہے۔ ٹکٹ لینے کے بعد ہم چیکنگ روم میں پہنچے۔ پہلے کرم دین کو ایک دیوہیکل مشین پر کھڑا کر کے اس کے جسم سے عجیب و غریب سی سرخ رنگ کی شعاعیں گزاری گئیں، اس کے بعد میری باری آئی۔ جونہی آپریٹر نے مجھے مشین پر کھڑا کر کے شعاعوں والا بٹن دبایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا جسم سینکڑوں ذرات میں تبدیل ہو گیا ہو۔ جب ان ذرات نے دوبارہ اکٹھے ہو کر میرے جسم کی شکل اختیار کی تو میں نے دیکھا کہ کرم دین ہے نہ ائر پورٹ ہے اور نہ وہ خوفناک مشین بلکہ میں بالٹی اٹھائے پاگلوں کی طرح سڑک پر کھڑا ہوں۔ میرے قدم خود بخود دودھ کی دکان کی طرف اٹھنے لگے۔

خادم حسین مجاہدؔ کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن ہی سے لکھتے آ رہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ طنز کی کاٹ کو برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

مزاحیہ

صداقت حسین ساجدؔ

انگلی کا کمال

نمبردار صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا گاؤں ہر لحاظ سے امن وسکون کا مظہر ہو۔ ہر طرف خوش حالی کا دور دورہ ہو۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ ایسا کیا کرے کہ اس کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔ آخر ایک دن اسے ایک خیال سوجھا، تو وہ اچھل پڑا۔ اب وہ ہر نماز کے بعد بڑے خلوص سے یہ دعا مانگنے لگا ''اے اللہ! تجھے تیری کبریائی کا واسطہ۔۔۔ مجھے شیطان سے ملا دے۔۔۔ ایک بار شیطان کی ملاقات مجھ سے ہو جائے۔''

وقت گزرتا گیا، لیکن اسے شیطان نہ ملا۔ دُعا مانگنا اس نے جاری رکھی۔ اسے امید تھی کہ ایک دن میری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔

ایک دن وہ اپنے ڈیرے پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ایک آدمی آ گیا۔ اس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ وہ نمبردار کے پاس آ گیا اور حال چال پوچھنے لگا۔

نمبردار کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور اتنی دلچسپی سے اس کا حال کیوں پوچھ رہا ہے؟ اس نے پوچھا ''اے اللہ کے بندے! میں تمھیں پہچان نہیں پا رہا۔۔۔ تم کون ہو؟''

نمبردار کی بات سن کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا ''عجیب بات ہے۔۔۔ مجھ سے ملنے کے لیے دن رات تڑپتے تھے اور جب میں ملنے آیا ہوں، تب ان جان بن رہے ہو۔''

یہ سن کر نمبردار چونک اٹھا ''میں سمجھا نہیں!''

''اب تم کیا سمجھو گے۔۔۔ میں وہی ہوں، جس کے لیے تم بڑے خلوص سے دعائیں مانگتے ہو۔''

نمبردار کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس وقت بھول چکا تھا کہ وہ کس لیے دعائیں مانگتا رہتا ہے۔

''میرا دماغ بالکل خالی ہے، تم ہی بتا دو۔'' نمبردار کا لہجہ لجاجت سے بھرا تھا۔

''میں شیطان ہوں۔۔۔۔''

یہ سنتے ہی نمبردار اچھل پڑا ''ہیں ں ں ں ں۔۔۔''

دوسرے ہی لمحے وہ اٹھا اور اس نے جھٹ سے شیطان کے سر سے پگڑی اتاری اور پھر اپنی پگڑی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کی پگڑی اپنے سر پر رکھ لی۔

شیطان ہکا بکا یہ دیکھ رہا تھا۔ نمبردار کچھ دیر کے بعد بولا۔

''دیکھ شیطان! اب ہم دونوں پگڑی بدل بھائی بن گئے ہیں۔۔۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' شیطان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بالکل! اب تم نے کچھ کھانا پینا ہے، تو وہ بتا دو۔۔۔ اس کے بعد آئندہ تم میرے گاؤں میں نہ آنا۔۔۔ یہ ایک بھائی کا تم پر حق ہے۔۔۔''

یہ سن کر شیطان کا منہ لٹک گیا۔ وہ تو کچھ اور سوچ رہا تھا، لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکل آیا تھا۔

''اب میں کیا کہوں۔۔۔ تم نے بڑی چالاکی سے مجھے گھیر لیا

ہے۔۔۔ٹھیک ہے، میں نہیں آؤں گا۔۔۔تم خوش رہو۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور چلتا بنا۔

نمبردار اپنے منصوبے کی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کا گاؤں ہر لحاظ سے ایک مثالی گاؤں ثابت ہوگا۔ پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ نمبردار کا فیصلہ ایک دم زبردست تھا۔

وقت گزرتا رہا اور راوی چین ہی چین لکھتا رہا۔

ایک دن نمبردار اطمینان سے اپنے ڈیرے پر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا ’’نمبردار صاحب۔۔۔نمبردار صاحب!‘‘

اس کے لہجے نے نمبردار کو چونکا کر رکھ دیا ’’کیا ہوا ہے۔۔۔تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟‘‘

’’وہ ادھر بازار میں لوگوں کے سر پھٹ گئے ہیں اور لڑائی وہ رہی ہے۔۔۔‘‘

یہ سنتے ہی وہ بے اختیار اچھل پڑا۔ ایک زمانہ ہوگیا تھا، اس کے گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ آج کیسے ہوگیا۔ وہ تیزی سے بازار کی طرف بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے اسے ایک خیال آیا، تو وہ اچھل پڑا۔

’’ہاں! یہی بات ہے۔۔۔آج میرا بھائی آیا ہے، اسی لیے تو یہ ہوگیا ہے۔‘‘

جب وہ بازار میں پہنچا، تو اس نے دیکھا کہ حلوائی کی دکان پر رش ہے، وہ ادھر بڑھا، تو کیا دیکھا کہ دکان کے اندر شیطان بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ چار بندے زخمی پڑے ہائے ہائے کر رہے تھے۔

یہ دیکھ کر نمبردار نے کہا ’’رہ نہیں سکے ناں! اور یہاں آتے ہی کام دکھا دیا۔‘‘

’’بھیا! تم غلط سمجھ رہے ہو۔۔۔‘‘

’’اچھا! تو پھر تم ہی سمجھا دو۔‘‘ نمبردار نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

’’بات یہ ہے کہ کافی عرصہ ہوگیا تھا، تو آج میں نے سوچا کہ بھائی کے گاؤں کو دیکھ آتا ہوں۔۔۔ یہاں آیا، تو ہر طرف خوش حالی اور امن دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔‘‘

’’واقعی! تم خوش ہوئے تھے، اسی لیے تو یہ جشن منایا۔‘‘

’’تم غلط سمجھ رہے ہو، میں تو کچھ بھی نہیں کیا۔۔۔‘‘

’’پھر کس نے کیا یہ سب کچھ؟‘‘ نمبردار نے تیزی سے کہا۔

’’بات یہ ہے کہ میں گھومتے پھرتے اِدھر آنکلا۔ حلوائی کی دکان دیکھی، تو چند لمحے ستانے کے لیے یہاں آبیٹھا۔ اس نے سیرہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اس میں ایک انگلی ڈبو کر دیوار پر لگا دی۔۔۔اب مجھے کیا پتا تھا کہ اس پر ایک مکھی آکر بیٹھے گی۔۔۔ اس مکھی کو دیکھ کر چھپکلی اس پر جھپٹا مارے گی۔۔۔چھپکلی کو دیکھ کر حلوائی کی بلی اس پر چھلانگ لگائے گی۔ یہ دیکھ کر باہر موجود مداری کی بندریا اس پر چھلانگ لگائے گی۔۔۔اب بندریا نے بلی کو زخمی کر دیا۔۔۔اپنی بلی کو زخمی ہوتا دیکھ کر حلوائی نے ڈنڈا اٹھا کر بندریا کو دے مارا۔۔۔بندریا نیچے گر کر تڑپنے لگی۔۔۔یہ دیکھ کر مداری سے رہا نہ گیا، اس نے اپنے ہاتھ میں موجود لاٹھی حلوائی کو جڑ دی۔۔۔آس پاس والے دکان دار حلوائی کی چیخ و پکار سن کر یہاں آ گئے اور پھر سر پھٹول شروع ہوگئی۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ دم لینے کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا ’’اب تم ہی بتاؤ کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔۔۔میں نے تو صرف ایک انگلی ہی لگائی تھی۔۔۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ معاملہ یہاں تک بڑھ جائے گا۔۔۔‘‘

یہ سن کر نمبردار نے کہا ’’واہ جی واہ! کتنے معصوم بن رہے ہو۔۔۔تمھیں بھی سمجھانا پڑے گا کہ انگلی ہی تو سارا کام کرتی ہے۔۔۔ چاہے بنا دے یا بگاڑ دے اور تمھاری انگلی کا تو کیا ہی جواب ہے۔‘‘

پھر وہ زخمیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اِتنے میں موقع دیکھ کر شیطان وہاں کھسک گیا۔

اس نے جو انگلی لگائی تھی، اب اُس گاؤں کو جانے کتنے عرصے تک اس کے کارنامے کا اثر سہنا تھا۔

صداقت حسین ساجد بچوں کے ادیب ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ بچوں کے تقریباً ہر رسالے میں ہر ماہ ان کی تحریریں تسلسل سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر خاصا شگفتہ اور دلآویز ہے۔ ’’ارمغانِ ابتسام‘‘ میں ان کی تحریریں گزشتہ برس سے شائع ہو رہی ہیں۔

م۔ ص۔ ایمن

لاتوں کے بھوت

شمس العارف ورکشاپ میں داخل ہوا۔ اپنے تمام دوستوں کو سلام کیا حسب دستور ساتھ ساتھ ہی حال احوال پوچھتا رہا۔اس کی ایک مٹھی میں کچھ تھا اور منہ بھی چل رہا تھا۔سعید نے پوچھ لیا کیا کھا رہے ہو؟ صبح ہی صبح۔۔۔اکیلے ہی اکیلے؟

شمس العارف نے مٹھی کھول دی۔اس میں ریوڑھیاں دیکھ کر سعید کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔اس نے ایک دو دانوں پر اکتفا نہیں کی بلکہ جتنی لے سکتا تھا لے لیں۔اب ان دونوں کے منہ چل رہے تھے۔ریوڑھیاں کڑک تھیں چبانے سے کرکراہٹ کی آواز بھی پیدا ہوئی۔ دوسرے ساتھی بھی متوجہ ہوئے۔شمس العارف نے غیر محسوس طور پر جیب سے کچھ اور ریوڑھیاں نکال لیں تھیں جو بھی آتا ریوڑھیاں پاتا۔سب کے منہ چلنے لگے۔حاضری لگوا کر سب اپنے اپنے روزمرہ کاموں میں مصروف ہوگئے۔اکرم بے حد شریر تھا وہ افسروں سے مذاق کرتے بھی نہیں چوکتا تھا۔تھوڑی دیر گزری تو اچانک ہی فرش پر گر کر لوٹنے لگا اس نے سختی سے پیٹ پکڑ رکھا تھا۔

سب اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔کوئی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہا ہے کوئی اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ایک نیا لڑکا جو کچھ دن قبل ہی بھرتی ہوا تھا۔فون کرنے دوڑا ''میں ایمبولینس کو فون کردوں۔''

''ایک منٹ ٹھہرو! اسے پانی وغیرہ پلاؤ۔اگر فرق نہ پڑے تو ڈاکٹر کو یہیں بلوالیں گے۔'' ایک پرانے نے کہا وہ جانتا تھا کہ اکرم اداکاری کر رہا ہے اسے کچھ نہیں ہوا۔

ایمبولینس اور ڈاکٹر کا سن کر اکرم نے آنکھیں کھولیں اور ''رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے کی'' اداکاری کرنے لگا۔

کیا ہوا کیوں ہوا؟ کا جواب اکرم نے یہ دیا کہ شمس العارف کی ریوڑھیاں کھانے سے یہ تکلیف ہوئی ہے۔

''وہ تو سب نے کھائی ہیں، سب کو ہونا چاہیئے کا یہ درد!''

''سب کو کیوں ہوتا؟'' اکرم دھاڑا ''اس سے پہلے بھی تمہیں کبھی درد ہوا ہے کسی کی کوئی چیز کھانے سے۔'' اس نے پیٹ دباتے ہوئے کہا۔

''تو تمہیں کیوں ہوا ہے؟''

''مجھ سے کنجوس آدمی کی کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی، پتہ نہیں کس نیت سے اس نے سب کو ریوڑھیاں کھلائی ہیں۔یہ تو تمہیں کچھ دن بعد پتہ چلے گا مجھے تو آج ہی پتہ چل گیا ہے۔''

تین دن پہلے ہی محمود مٹھائی کا بڑا ساڈبہ ساتھ لایا تھا اور مٹھائی بانٹنا شروع کردی تھی۔معلوم ہوا کہ محمود کو اللہ نے بیٹے کا باپ بنا دیا ہے اور وہ اس خوشی میں مٹھائی لایا ہے۔ مبارک سلامت ہوتی رہی سب مٹھائی کھاتے جاتے اور محمود کو خیر و برکت کی دعائیں دیتے جاتے۔

ورکشاپ کے تمام ساتھیوں نے از خود ہی یہ اصول سا بنا لیا تھا کہ کسی کے ہاں کوئی خوشی ہوتی تو وہ اپنی خوشی میں دوسروں کو بھی شامل کرتے۔چائے شائے، مٹھائی وٹھائی، بریانی شریانی، جس کی جو حیثیت ہوتی وہ کچھ نہ کچھ لے آتا۔کچھ جو زیادہ کی گنجائش رکھتے

اپنے ساتھیوں کو چھٹی کے دن اپنے گھر پر دعوت دے دیتا، جو پہنچ سکتا پہنچ جاتا۔

شمس العارف کا ریکارڈ تھا کہ وہ کھانے میں پیش پیش ہوتا لیکن کھلانے میں وجہ ڈھونڈنے لگتا۔

ریوڑھیاں کھانے والوں نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کیوں کھلا رہا ہے لیکن اکرم نے نوٹ کرلیا تھا کہ کوئی خاص وجہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا بھی بیٹا ہوا ہے اور اس نے اس چال سے ریوڑھیاں کھلا کر سب کا منہ میٹھا کر دیا ہے اب وہ دعوت پر اصرار نہیں کر سکتے لیکن دوستوں نے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔

آخر اس نے دوستوں کے کہنے پر سب کی دعوت کردی۔ طے ہوا کہ اتوار کی صبح سب ناشتہ اس کے گھر پر کریں وہ سب کی پائے کی دعوت کرے گا۔

سب پہنچ گئے۔ شمس العارف کی سخاوت موضوع گفتگو تھی کہ یار اس نے کیسے دل بڑا کرلیا، آفرین ہے یار!۔۔۔ شاباش ہے یار شمس العارف کو اس نے آج سب کا ریکارڈ توڑ دیا ہے، اتنی ہمت تو فلاں میں بھی نہیں ہے اس نے بھی فلاں موقع پر کباب ہی کھلائے تھے۔ یار اس نے تو کمال ہی کردیا، پائے کی دعوت کر ڈالی وہ بھی کڑکتی سردیوں میں؟ ایک ایک پایا پتہ ہے کتنے کا ہے؟۔۔۔ بھینس کے ہوں گے،۔۔۔ نہیں گائے کے ہوں گے ۔۔۔ نہیں یار دعوت جو کی ہے تو بھینس کے ہی ہوں گے۔۔۔ بھینس کے مہنگے ہوتے ہیں گائے کے ہی ہوں گے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

دعوت شروع ہوئی تو سب کے چہرے لٹک گئے۔ جنہیں وہ گائے یا بھینس کے سمجھ رہے تھے وہ مرغی کے پائے ثابت ہوئے۔ کچھ تو بلا لحاظ ہی دستر خوان سے اٹھ گئے، باقی جو اپنے گھر مرغی کے پائے کھانے کے عادی تھے انہوں نے اپنا کرایہ پورا پورا وصول کیا اور خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ آخر انہوں نے یہاں تک آنے کا کرایہ خرچ کیا تھا اور واپسی میں پھر کریں گے۔

دعوت ختم ہوئی۔ سب نے ''آئندہ کل'' شمس العارف کی کلاس لینے کی ٹھانی کہ یہاں اس کے گھر تو اسے کچھ نہیں کہتے لیکن کل دیکھیں گے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ورکشاپ میں تاج صاحب آئے اور بولے ''ہاں بھائی سنا ہے کل تم لوگ پائے کھانے گئے تھے۔''

اکرم بولا ''جی ہاں اور لاتیں کھا کر واپس آگئے۔''

''یہ شمس العارف نے اچھا نہیں کیا!'' جاوید بولا ''بھئی پائے کھلانے کی توفیق نہیں تھی تو نام بھی نہ لیتا پائے کا۔۔۔ یہ تو کھلا دھوکا ہے۔''

اقبال نے کہا ''میں بھی کہوں کہ شمس العارف جیسا کنجوس آدمی جو ہمیں ریوڑیوں پر ٹرخا رہا تھا اتنا سخی کب سے ہوگیا کہ اس کڑکڑاتی سردی میں پائے کھلا رہا ہے۔''

اتنے میں شمس العارف آتا دکھائی دیا جو لوگ اس کی کلاس لینے کے چکر میں تھے وہ بھی چپکے ہو رہے۔ سب نے گویا تہیہ کرلیا تھا کہ شمس العارف سے کوئی بات نہیں کرے گا۔

شمس العارف ورکشاپ میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''یہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔''

تاج محمد دوسرے سیکشن سے تعلق رکھتے تھے وہ ابھی موجود ہی تھے بولے ''ہاں بھئی شمس العارف سنا ہے تم نے کل ان سب کی دعوت کی تھی پائے کی۔''

شمس العارف بولا ''ہاں تاج صاحب! کیا کرتا گنجائش نہیں بنتی تھی مہینے بھر کے لیے تنخواہ ملتی ہے تو پندرہ دن چلتی ہے بمشکل بیس تک کھینچتے ہیں اور پھر لالے پڑ جاتے ہیں، ان کی فرمائش تھی تو میں نے اپنی حیثیت کے مطابق ان سب کی دعوت کر ڈالی۔ مجھے معلوم تھا ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔''

اکرم نے لہکتے ہوئے گانا گانا شروع کیا:

لاتیں تو بہت کھائی ہیں پایا نہیں کھایا

م۔ص۔ ایمن کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے رسائل میں ان کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔ ''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے۔ بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ اندازِ بیان میں شگفتگی اور شائستگی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ہم نے دستخط کئے

ڈاکٹر امواج الساحل

یہ تقریباً ۱۹۸۹ء کی بات ہے، ایک ہم وطن دوست کے اصرار پر کہ ہمیں بھی بچوں کے مستقبل کے لئے کچھ سامان پاکستان بھیجنا چاہئے تا کہ محفوظ رہے اور بوقت ان کی شادی کام آسکے۔ ہم نے بھی ارادہ کر لیا کہ کچھ سامان بک کروادیں۔ کچھ ہماری کتابیں تھیں عربی کی، جنہیں لے جانا تھا کہ شاید ان کو پڑھ کر نسلیں سنور جائیں۔۔۔ تو کافی سامان ہو گیا جسے ہم نے بک کروادیا۔ تین چار روز بعد ہماری فلائٹ تھی، سوچا تھا کہ سامان کون سا کہیں بھاگا جارہا ہے یہیں لاہور ایئر پورٹ پر ہی رہے گا، ہم فیصل آباد پہنچ کر تین چار روز آرام کر کے پتہ کرنے آجائیں گے مگر قسمت میں آرام ہو تب ملے نا۔ ہم رات کو اپنے گھر پہنچے اور صبح ہوتے ہی ایک ایجنٹ آگیا کہ جی آپ کا سامان ہم کلیئر کروائیں گے۔ ہم نے کہا آج تو ممکن نہیں البتہ کل سفر کریں گے، یہ ذہن میں رہے کہ ہمارے گاؤں سے لاہور کم از کم پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔

اگلے دن ہم نے صبح ہی صبح بچوں کو ان کی تائی اماں کے پاس چھوڑا۔ مجھے چھوٹے کی فکر زیادہ تھی جو تین سال کا تھا، کہ کہیں روتا نہ رہے، مگر شکر ہے کہ اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ بہلا رہا۔ ہم عازم سفر ہوئے اور پانچ چھ گھنٹے مسلسل سفر میں رہ کر راستے کی گرد وغیرہ سے بھی کافی مستفیض ہوئے، وہاں ٹھہرنے کا بالکل پروگرام نہیں تھا، چھوٹے بچے کی وجہ سے۔ اس لئے سیدھے ایجنٹ کے

آفس چلے گئے، سامان میرے نام بک تھا۔ جب میں آفس میں داخل ہوئی تو حلیہ بالکل عجیب سا لگ رہا تھا، برقع بمع نقاب کے پہنا ہوا، گرد و غبار کی بہار۔۔۔ اس نے ہمیں ویلکم کیا ٹھنڈی بوتلیں پلائیں تو کچھ سانس بحال ہوا، بات چیت ہوئی آخر میں کہنے لگا ''جی میں جا کر سامان ریسیو کر لیتا ہوں، آپ کو فکر کی ضرورت نہیں، آپ میں سے ایک مرد آجائے میرے ساتھ، اور خالہ صاحبہ کے دستخط چاہئیں، یا شاید آپ انگوٹھا لگائیں گی۔''

میں تو اس اچانک حملے پر چپ کی چپ ہی رہ گئی۔ سوچنے لگ گئی کہ اگر میرے ماتھے پر ان پڑھ لکھا بھی ہوتا تو بھی وہ ڈھکا ہوا ہے، اس نے کیسے یہ کہہ دیا، ساتھ میں میاں کے بھانجے تھے جو اس وقت باٹنی میں ایم فل کر رہے تھے، بولے ''یہ خالہ تمہارے لاہور سے ایم اے عربی میں گولڈ میڈلسٹ ہیں، اور ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے انہوں نے۔ تم کاغذات لے کر آؤ۔''

وہ تو پسینہ پسینہ ہو گیا اور کرسی چھوڑ کر چلا گیا۔ کافی دیر بعد ایک

اور لڑکا آیا۔ اس نے سارا کام مکمل کروایا۔ ہم نے پہلے کی بابت پوچھا تو کہا کہ وہ بزی ہے۔

اس دن سے بھانجے نے میری چھیڑ بنالی ''مامی جی دستخط کریں گی یا انگوٹھا لگائیں گی؟''

کچھوا اور خرگوش

عائشہ تنویر

کچھوے اور خرگوش کی ریس سے کون واقف نہیں۔ قصہ کچھ یوں ہوا کہ کچھوے کا اس جیت میں کوئی کمال نہیں بلکہ ایک بیوقوف خرگوش نے اپنی ساری برادری کی ناک کٹوادی۔ بھئی سونا ہی تھا تو جیت کے نشان پر پہنچ کر سو جاتا لیکن اتنا عقلمند ہوتا تو اسے ''خر'' گوش کون کہتا۔

محققین سے یہ بھی سنا ہے کہ خرگوش غریب کسان گھرانے کا تھا۔ پانی کی باری کے لئے ساری رات بیٹھا رہا اور امیر زمیندار کچھوا اس کی باری لگا کر خود آرام سے سو گیا اور فتح یاب ہوا۔۔۔ واللہ اعلم۔

ماضی میں خواہ کچھ بھی ہوا ہو لیکن اب نئی نسل کا نوجوان خرگوش اپنے آباء کی بیوقوفیوں کے سبب اٹھانے والی ذلت سے بیزار تھا۔ وہ خود کو نئے زمانے کا پروردہ، روشن خیال، پڑھا لکھا جانتا تھا۔ سمجھتا کہ اب نظام بدل گیا ہے۔ اب ہم دھوکے اور ظلم کا شکار نہیں ہوں گے۔

سو خرگوش نے دوبارہ کچھوے کو ریس کی دعوت دی۔ جدی پشتی رئیس کچھوا جو ہر وقت اپنے ہاتھ میں آئی فون لیے سوشل میڈیا پر مصروف رہتا۔ ناشتہ، کھانا بھی بستر پر منگوا لیتا، اس تک اطلاع پہنچی تو شان بے نیازی سے بولا ''اعتراض ہمیں کوئی نہیں لیکن یہ بائیک یا گاڑی پر ریس ہوگی کیونکہ ہم اتنا چلنا نہیں چاہتے۔''

خرگوش سن کر سٹپٹا گیا۔ وہ تو اپنے چائنا موبائل میں جی۔ پی۔ ایس گیم ڈال کر ریس کی تیاری کرتا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پوکیمان مارتا اور خود کو سورما سمجھتا تھا۔ اب غریب

خرگوش کچھوے کے ساتھ ریس کے لیے گاڑی کہاں سے لاتا لیکن مقابلے کی دعوت تو اس نے دی تھی، پیچھے ہٹتا تو اور بے عزتی ہوتی، اس لئے دوست کے گیراج سے گاڑی مانگنے کا سوچ کر ریس کی تیاری میں لگ گیا،

ریس والے دن کچھوا اپنی درآمد شدہ نئے ماڈل کی گاڑی میں آیا۔ خرگوش کو بھی بظاہر اچھی گاڑی ہی مل گئی تھی۔ سارے تماشائی پر جوش تھے لیکن خرگوش نہ جانتا تھا کہ کچھوے نے اس کے گیراج والے دوست کو پیسے دے کر خرید لیا تھا۔ اس نے گاڑی میں گڑ بڑ کر دی۔ ریس شروع ہوئی اور تھوڑی دور جا کر ہی راستے میں خرگوش کی گاڑی خراب ہوگئی، وہ بے چارہ اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا رہا اور کچھوا ریس جیت بھی گیا۔ سب نے اسے کندھوں پر اٹھایا اور نعرے لگانے شروع کئے۔

خرگوش بیچارے کو سب نے طعنے دینے شروع کر دیے'' کم عقل خرگوش کا ایک شکست سے دل نہیں بھرا تھا جو دوبارہ مقابلے کی دعوت دے دی۔''

کچھوے نے خرگوش کو کہا'' بیٹا، تمہاری غلط فہمی ہے کہ نظام بدلا ہے۔ جیت آج بھی طاقت اور پیسے کی ہے۔''

غیر اخلاقی سبق: جیت تو پھر جیت ہے چاہے بے ایمانی سے ملے۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ